چشمِ نم

سفرنامہ



نوشابہ صدیقی

چشمِ نم

نوشابہ صدیقی

RB

رب پبلشرز
کراچی

• نوشابہ جب میرے گھر آئی تو دیگر سامان سے پہلے اپنے ساتھ ایک بڑا لفافہ لے کر آئی جس میں بہت سارے ایسے تحریر شدہ کاغذات رکھے تھے جن پر کم وبیش ایک صدی گزر چکی تھی کہ ان کاغذات کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا۔ روشنائی معدوم ہونے کے قریب تھی۔ کاغذات کے کونے ہی نہیں بلکہ درمیان سے بھی بُھر بُھرے ہو کر جھڑ چکے تھے۔ ان ہی میں بالشت بھر سے بھی چھوٹی دو ڈائریاں تھیں، جن میں ایک اس کے ابا کی شاعری پر مشتمل تھی جو خود ان کے ہی ہاتھ سے تحریر تھی۔ دوسری ڈائری میں تاریخی نظمیں، پیدائش اور موت پر نکالی گئیں تاریخی نظمیں تھیں کہ انہیں اس فن پر عبور حاصل تھا۔ ان ہی میں ایک کتاب رشید احمد صدیقی کی گنج ہائے گرانمایہ تھی جس میں اس کے ابا کے انتقال پر لکھا گیا خاکہ شامل ہے۔ یہ لفافہ اس کے زیورات سے زیادہ قیمتی تھا کہ اس نے میرے گھر میں آتے ہی اسے الماری کی سب سے خفیہ جگہ رکھ کر تالا لگا دیا تھا اور اس کی چابی اس جگہ چھپائی تھی کہ 38 سال گزرنے کے بعد آج بھی اس جگہ کا مجھے علم نہیں۔

لیکن ان کاغذات میں چھپی تحریریں اس کی زبانی مَیں نے آج تک بلا مبالغہ ہزار بار سنی ہیں کہ نوشابہ بس ان ہی تحریروں میں جیتی ہے۔ اس کے غم اور خوشیاں بس ان ہی کاغذات میں دفن ہیں۔

(باقی آخری فلیپ پر)

چشمِ نم

سفرنامہ

نوشابہ صدیقی

RB رب پبلشرز، کراچی

کتاب: چشمِ نم......سفر نامہ

مصنفہ: نوشابہ صدیقی

اہتمام: نثار اختر

Email: nisar.akhtar.noor@gmail.com
Phone: 92-21-35870600

سرورق: نصر اللہ ناصر، رب پبلشرز

کمپوزنگ، لے آؤٹ: محمد نعیم، سعد اللہ ساحر

طبعِ اوّل: جنوری 2015ء

طابع، پبلشرز: رشید بٹ، حمیرا اطہر،
رب پبلشرز، 10 دے مہر ٹیرس، اسٹریٹ۔6،
برنس روڈ، کراچی۔74200، فون: 021-32636133
Email:contact_rb44@yahoo.com,contact.rb44@gmail.com

قیمت: -/500 روپے

ISBN: 978-969-9466-47-2

contact author: ashernoor@gmail.com

یہ ہمارے بچوں کے بچے ہیں



شیما۔مریم۔طرب۔آمنہ۔ریان۔شایان۔حسن۔یوسف

یہ بچے میرا آنے والا کل ہیں۔
مَیں اپنا گزرا کل ان کے نام کرتی ہوں

حُسنِ ترتیب

		صفحہ
● انتساب		3
● ...... میری کہانی	نوشابہ صدیقی	9
● فلیپ	نثار اختر	
● کراچی سے علی گڑھ ہوسٹل کے منٹو-E تک		15
● غالبؔ کے شہر دہلی میں		27
● ڈھائی دن علی گڑھ میں		35
● آگرہ میں دو درسگاہیں اور تاج محل		45
● علی گڑھ سے اعظم گڑھ تک ریل کا سفر		56
● غازی پور اور حسن منزل، میری جائے پیدائش		68
● میرے آباء واجداد کا گاؤں		90
● میری اماں کے بچپن کا آنگن		100
● پھر دہلی کی طرف رواں		106

صفحہ

دوسرا حصّہ: کچھ تحریریں...... کچھ تصویریں

- اخباری تراشے 121
- پوسٹ کارڈ 123
- دو سرٹیفکیٹ 125
- پی ایچ ڈی کے لیے داخلے کے 3 عدد فارم 127
- تصویریں نظر کی تحریریں ہوتی ہیں! اس سفر کی چند تصاویر 132

تیسرا حصّہ: آباؤ اجداد

- مولوی محمد علی قاریؔ سرولوی...... مولانا سعود الحسن ندوی، استاد مدرسہ دینیہ، غازی پور
  جریدہ ''کاروانِ ادب'' لکھنؤ سے انتخاب 171
- میرے ابّا حسن عبداللہ حسنؔ کی تصویر 179
- جدِّ بزرگوارم 181
- اپنے دادا کے نام 182
- یادگار کنواں 184

چوتھا حصّہ

- صمد سرولوی...... مولانا مشکور عالم، استاد مدرسہ دینیہ، غازی پور 187
- مولوی عبدالصمد صاحب سرولوی
  ماہنامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، شمارہ مارچ 1999ء سے انتخاب 192
- تحریر ایک نوٹ کی صورت میں 200
- مرثیہ...... از قاری محمد علی (برادر) 201

صفحہ

- نیاز نامہ بجناب مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی......1928ء 205
- تصاویر مولوی یحییٰ ولد عبدالصمد 206

پانچواں حصّہ

- میرے دادا مولوی ابوالحسن کی تصویر 209
- ...وی ابوالحسن کی زندگی کے آخری ایام کی نایاب تصویر 210
- وقت کا دل 211
- ہمارے دادا مولوی ابوالحسن 219
- کمال یارِ جنگ تعلیمی کمیٹی رپورٹ......اردو/انگریزی 221
- خطوط 228

☆☆☆

......کہانی میری

کہتے ہیں سفر وسیلۂ ظفر ہوتا ہے۔ بڑے جو کہہ گئے ہیں وہ ہمیشہ صحیح ہی ہوتا ہے۔ اپنی شعوری زندگی کا پہلا سفر جو مَیں نے ہندوستان کے لیے کیا، وہ میرے اندر بڑی قوت بھر گیا ہے۔

مَیں زندگی بھر سے ان جگہوں کو دیکھنے کی آرزومند تھی جو میرے آباؤاجداد سے متعلق تھیں۔ وہ شہر، وہ گاؤں جو اُن کا تھا۔ وہ گھر جو رہنے کے لیے اُنہوں نے بنائے۔ وہ راستے جن پر وہ چلے۔ وہ موسم جو اُن پر گزرے۔ وہ درسگاہیں جہاں انہوں نے علم حاصل کیا۔ وہ ادارے جہاں انہوں نے کام کیا۔ وہ مسجدیں جہاں انہوں نے نمازیں ادا کیں۔ وہ دوست، وہ پڑوسی جو اُن کے تھے۔ اُن کے کیسے روابط رہے۔ کیا وہاں آج بھی اُن کے نام لیوا ہیں۔ کیا اُن کا نام زندہ ہے۔ ہاں یہ مجھے معلوم تھا کہ اُن کی کتابیں ان کی تحریریں، ان کی لائبریریاں، اُن کا سامانِ زندگی سب کچھ لُٹ چکا ہے۔ وہ مجھے دیکھنے کو نہیں ملے گا۔ کھیت ویران ہو چکے ہیں۔ باغ اجاڑ ہو گئے ہیں۔ کنویں سوکھ گئے ہیں۔ ہجرت نے اُن کے بچوں اور اُن بچوں کے بچوں کو اُن تمام چیزوں سے محروم کر دیا ہے۔ مَیں یہ جانتی تھی اور مجھے اس بات کا دکھ بھی نہیں تھا۔ مگر ہاں میں حلیمہ منزل دیکھنا چاہتی تھی۔ مَیں محمد علی منزل میں داخل ہونا چاہتی تھی۔ اپنے گاؤں کے کنویں میں جھانکنا چاہتی تھی۔ اپنے کھیت میں گیہوں، جَو، گنے کی کھڑی فصل دیکھنا چاہتی تھی۔ خواہ اس کا مالک اب کوئی بھی ہو۔ مَیں اپنے شہر کی حسن منزل اور صمد منزل میں کچھ دیر رک کر سانس لینا چاہتی تھی جو میرے ابا، دادا اور پردادا کی ملکیت تھی۔ اور جن کی مَیں وارث بھی تھی۔ مَیں اُن مدرسوں میں جانا چاہتی تھی جو میرے

آبا وَاجداد کے دم قدم سے چلتے تھے۔ اوراُن درسگاہوں کو آنکھوں سے چُومنا چاہتی تھی جہاں سے انہوں نے علم حاصل کیا۔ مَیں نے جانے میں بہت دیر کردی۔ سرکاری ملازمت کی پابندیاں، سرحدوں کی چھیڑ چھاڑ نے میرا راستہ روکے رکھا۔ کبھی بچے چھوٹے تھے۔ کبھی وہ پڑھ رہے تھے اور کبھی ان کی شادی کی فکر تھی۔ مَیں ان جھمیلوں میں اپنے لیے فیصلہ کرنے میں آزاد نہیں تھی۔ اورسب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے شاید میرے لیے 2014ء ہی سفر کے لیے چنا ہوا تھا۔

مجھے یقین ہی نہیں آتا کہ چودہ اپریل کو اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کی شادی کے فوراً بعد مَیں نے چپ چاپ یہ فیصلہ کرلیا کہ دوسروں کے لیے جینے کا وقت ختم ہوگیا۔ اب مَیں اپنے لیے جینے نکل پڑوں گی۔ 24 اپریل میری سالگرہ کا دن تھا۔ مَیں اس دن اپنے دن رات شمار کررہی تھی۔ عادت ہے ماضی میں رہنے کی۔ ماضی کی، کہانی بُنتے بُنتے میری آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔ مجھے میرے ابا علی گڑھ سے آواز دے رہے تھے۔ جو قیامِ پاکستان سے قبل اس عظیم درسگاہ کے قبرستان میں اپنا چھوٹا سا گھر بنا چکے تھے، جہاں وہ دل وجان سے کام کرتے تھے۔ سب کی آنکھوں کا تارا تھے۔ ہر کوئی انہیں چاہتا تھا۔ ان سے محبت کرتا تھا۔ خوش رُو، خوش لباس، ایسے ایمان دار کہ یونی ورسٹی کو دوسرا اور کوئی اس اہم پوسٹ کے لیے نہ مل سکا جو دوسری عالمی جنگ کے زمانے میں یونی وَرسٹی کو مطلوب تھا۔ وہ پروفیسر کے بجائے مسلم یونی ورسٹی میں اسٹیوارڈ کے عہدے کے لیے چُن لیے گئے۔

حکام کے اس مقولے کو رد کرنا بھی آسان نہ تھا کہ پروفیسر تو آج نہیں کل مل ہی جائے گا۔ ایسا ایماندار میرِ سامان سوا حَسن عبداللہ کے اور کوئی نہیں۔ یہ بات ان کے استاد رشید احمد صدیقی نے ''گنج ہائے گرانمایہ'' میں لکھ دی۔ اس رات ابا کی آواز براہِ راست میرے کانوں میں گونجی۔

میرے دادا نے غازی پور کی حَسن منزل سے آواز دی۔ پردادا نے صمد منزل اور محمد علی منزل سے بلانا شروع کردیا۔ دادی نے اپنے بازو پھیلا دئے۔ اماں کے بچپن کا آنگن مجھے دیکھنے کا خواہاں تھا۔ میرے اَن دیکھے بھائی بہن بھی ان ہی شہروں میں تھے جو کبھی میرا بھی شہر تھا۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور اسی دن مَیں نے درخواست جمع کرادی۔ اس پورے یقین کے ساتھ کہ میرے ابا، دادا کی پکار رائیگاں جائے گی۔ میرے گھروں کی صدائیں صدا بہ صحرا رہیں گی۔ مجھے مہینوں بعد کورا

پاسپورٹ تھما دیا جائے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ ٹھیک چار دن بعد 28 اپریل کو میرے ہاتھ میں جو پاسپورٹ پکڑایا گیا، اس پر تین مہینے کے ویزے کی مہر تھی۔ نہیں یقین آتا تھا کہ ابا کے بلانے میں ساٹھ سال کیوں لگے۔ میرے گھروں، گاؤں، کھیت اور موسم نے مجھے اتنے دنوں بعد شدت سے کیوں یاد کیا۔ 19 مئی پی آئی اے کا جہاز بغیر ایک منٹ لیٹ ہوئے مقررہ وقت پر دلی ایئرپورٹ پر اتر گیا۔ ہر بات یقین کے خلاف تھی پی آئی اے لیٹ نہ ہو۔ ویزہ جلدی مل جائے اور مَیں اپنی ان ذمہ داریوں سے فوری سبک دوش ہونے کے لیے تیار ہو جاؤں جنہیں مَیں نے غیر ضروری طور پر لاد رکھا ہے۔

تین مہینے بغیر پولیس رپورٹ پانچ شہروں کے ویزے نے مجھے ہر قسم کے تناؤ سے آزاد کر دیا تھا۔ مَیں نے پندرہ دن بعد واپسی کا ٹکٹ یوں لیا تھا کہ بھلا وہاں کون میرا منتظر ہے۔ قبر سے آتی آواز، ٹوٹے پھوٹے کھنڈر نما گھر، اجڑے کھیت، سوکھے کنویں، نامانوس سڑکیں میرا بھلا کیا استقبال کریں گی؟

مگر یہ کیا ہوا کہ پندرہ دن تو لمحے بھر میں گزر گئے۔ ابا کی قبر روز مجھے آواز دیتی تھی۔ سرسیّد کی درسگاہ نے مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ دادا کے کارناموں کے ڈھیر میرے سامنے تھے۔ پردادا کا نام یونی ورسٹی کی دیوار پر چمک رہا تھا۔ وہ تو میرے ماتھے کا جھومر بن گیا۔ ابا کی درسگاہ نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور حسن منزل، صمد منزل نے میری آنکھوں میں ڈھیروں آنسو بھر دیے۔ اپنے گاؤں کے اجڑے کھیت شکوہ کر رہے تھے۔ تم دیر سے آئیں۔ باغ کے نام ونشان مٹ گئے تھے۔ نہ آم کے درخت تھے، نہ امرود کے۔ جانے کہاں گئے وہ ڈھیروں خربوزے اور سنگھاڑے جو ٹوکروں میں بھر کر آیا کرتے تھے۔ دو سو سال پرانے کنویں نے اپنے اندر مجھے جھانکنے کے لیے کہا جو ہماری یاد میں روتے روتے خشک ہو چکا تھا۔ مَیں نے اپنی آنکھوں سے جتنا ہو سکا پانی اس میں ٹپکا کر چاہا کہ وہ پھر سے ٹھنڈا میٹھا پانی فراہم کرنے کے قابل ہو جائے۔ مگر وہ کہتا ہوا محسوس ہوا تم لوگ دور چلے گئے۔ ہمیں بھول گئے۔ ہم تمہاری راہ تکتے تکتے خشک اور بنجر ہو گئے۔ حسن منزل کی خاموش آواز میرے دل کو چیرے جا رہی تھی۔ مَیں اس کی وارث تھی۔ مَیں وہاں پیدا ہوئی تھی۔

مَیں وہاں کے آنگن میں کھیلی تھی۔ میرے نام کی بکری اور مرغی وہاں میرے ہاتھوں سے دانہ چگتی تھیں۔ حسنِ منزل کی آنکھوں سے خون برس رہا تھا اور میرا دل خون میں لت پت تھا۔ امّاں کا بچپن والا آنگن نانا، نانی کی یاد دلا رہا تھا۔

مَیں تمام جگہوں کی تصویریں بنا کر گویا ان مختصر ملاقاتوں کو قید کرنا چاہتی تھی۔ اپنے بچوں اور بچوں کے بچوں کے لیے کہانی بُنتے اپنے ملک اپنے شہر میں واپس آ گئی۔ بس اب کرنے کو کچھ نہیں بچا۔ زندگی بھی اپنے وہ تمام دن پورے کر چکی ہے جو اپنے ہاتھ پاؤں سے گزاری جاتی ہے۔ بونس کی زندگی کا دور شروع ہو چکا ہے۔ بچے ہجرت کر گئے ہیں۔ ہمارا ملک اب ''سینئر سٹیزنز'' کا ملک بن کر رہ گیا ہے۔ ہر گھر کے بچے دوسرے ملک جا چکے ہیں۔ ماں باپ انتظار میں دن گزارتے ہیں۔ اپنے بچوں سے زیادہ اپنے بچوں کے بچوں کا انتظار کرتے ہیں۔ نظروں نظروں میں ان کے قد کا تعین کرتے ہیں۔ میری یہ کہانی بس ان ہی کے نام ہے مگر نہ وہ اردو زبان جانتے ہیں، نہ انہیں ماضی کی کہانیوں کا شوق ہے۔ نہ وہ مطالعے کے شوقین ہیں کہ اپنی زبان، ماضی اور کتابیں فرسودہ روایات ہیں۔ پھر بھی کبھی نہ کبھی خاندان میں کوئی ایک بچہ پیدا ہوگا جو ان فرسودہ روایات کو گلے لگائے گا۔ اپنی زبان سیکھے گا۔ آباؤ اجداد کو یاد کرے گا اور کتابوں کی گرد جھاڑ کر پڑھنے بیٹھے گا۔ یہ سفرنامہ بس اسی بچے کے لیے ہے۔ مَیں نے چشمِ نم کے ساتھ اُسی کے لیے تو تحریر کیا ہے۔

کیا وہ چشمِ تر کے ساتھ اسے قبول کرے گا؟ پڑھے گا؟ اور آگے اپنے بچوں کے لیے محفوظ کر لے گا؟ یہ سوال مَیں اپنے آپ سے روز کرتی ہوں۔ جواب نہ بھی ملے، سوال تو بہرحال اپنی جگہ اہم ہے۔ میرے لیے اہم تر ہے۔

سفرنامے کے بعد ایک اور حصّہ ہے جو ہندوستان کے سفر کے باعث مجھے حاصل ہوا۔ کچھ لوگ، کچھ ادارے، کچھ نایاب خطوط، کچھ خصوصی جگہیں، کچھ تصاویر جو سب کی سب اسی سفر سے متعلق ہیں۔ اگر مَیں اتنے عرصے بعد بھی وہاں نہ جاتی تب یہ تمام چیزیں، تمام تحریریں ضائع ہو جاتیں۔ دیگر چیزوں کی طرح۔

اسی لیے مَیں انہیں اس کتاب میں جگہ دے رہی ہوں۔ یہ جانتے اور مانتے ہوئے کہ یہ تمام

چیزیں میرے لیے اہم ہیں، آنے والوں کے لیے شاید اہم نہ ہوں بلکہ غیر ضروری ہوں۔ پھر بھی انہیں شامل کر رہی ہوں۔ ایک تو یہ کہ مَیں خوش امید ہوں۔ شاید کسی کو صدی دو صدی بعد بھی اس کی ضرورت پیش آ جائے، دوسرے یہ کہ میرے لیے تو بہر حال بہت قیمتی ہیں۔ اور مَیں انہیں کتاب میں محفوظ کر دینا چاہتی ہوں کہ کتاب سے زیادہ محفوظ دنیا کوئی اور ہے ہی نہیں۔

نوشابہ صدیقی

یکم جنوری 2015ء

❑

کراچی سے علی گڑھ ہوسٹل کے منٹو-E تک

زندگی میں بہت ساری خواہشات ہوتی ہیں جو آپس میں مقابلہ کرتی ہیں اور ان میں ایک دوڑ کی سی کیفیت ہوتی ہے۔ اس دوڑ میں جو خواہش سب سے آگے نکل جاتی ہے وہ اپنے وسائل کی موجودگی میں سب سے پہلے پورا ہونے کا حق رکھتی ہے۔ یہی علمِ معاشیات بھی ہے۔ مَیں اسی علم کی ادنیٰ سی طالبِ علم رہی ہوں۔ پڑھنے کے بعد اسی علم کو پڑھاتی رہی ہوں۔ ہر بار اپنے طالب علموں کو معاشیات کی یہ تعریف بتانے کے بعد خود سوچا کرتی، میری بھی تو بہت ساری خواہشات ہیں جو دوڑتی رہتی ہیں اور اپنے اپنے وسائل تلاش کر کے پوری بھی ہو جاتی ہیں لیکن بڑے بڑے صاحبانِ علم کے بنائے ہوئے اصول اور ان کی بتائی ہوئی تعریف مشیتِ ایزدی غلط ثابت کر دیتی ہے۔ دراصل خواہشات پورا ہونے کا سارے کا سارا دارومدار اللہ تعالیٰ کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے۔ جب ہی تو میری شدید خواہش اپنے وسائل رکھنے کے باوجود تشنۂ تکمیل ہی رہی۔ مَیں نے جب سے شعوری طور پر آنکھیں کھولیں، ایک اَن دیکھی دنیا میں جیتی رہی ہوں۔ یہ خواہش ہر وقت میرے دل میں کہیں نہ کہیں چھپی رہی کہ مَیں وہ دنیا دیکھوں جہاں میرے آباؤ اجداد نے زندگی گزاری اور ایسی گزاری کہ ہمیں تحفے میں وہ غرور دے گئے کہ جن کے سہارے ہم نے فخر اور اطمینان سے زندگی بسر کی۔ ایک شعر مَیں مدتوں سے دہراتی رہی ہوں۔

تھے وہ آباء تو تمہارے ہی مگر تم کیا ہو
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

آباؤاجداد کو یاد کرنا، ان کی بڑائی کو سمجھنا، اپنے اندر غرور پیدا کرنا، سب کچھ اچھا ہے لیکن اُن جیسا بننا بھی تو ضروری ہے۔ شاید مَیں یہ ضروری کام تو نہیں کرسکی مگر ہاں ماضی کے وہ تمام کارنامے جو ان کے نام کے ساتھ ہمارے خاندان میں چاند ستاروں کی روشنی پھیلاتے رہتے ہیں مجھ سے ہمیشہ ہم کلام رہے۔ وہ چاہتے رہے کہ مَیں ان تمام شہروں میں جاؤں۔ ان مقامات کو دیکھوں جہاں اب ان کے نقشِ پا تو نہیں ہوں گے مگر دل کی آنکھیں شاید وقت گزر جانے کے عمل کو بھی شکست دے دیں اور ہمیں وہ نقشِ پا نظر آجائیں۔ ہم ان پر اپنے پاؤں رکھیں، بالکل اس طرح جیسے ہر چھوٹا بچہ جب چلنا سیکھتا ہے تب اپنے جوتوں سے زیادہ اپنے بڑوں کے جوتوں میں پاؤں رکھ کر چلنا چاہتا ہے۔ بڑے بڑے جوتے ننھے سے وجود کو چلنے تو نہیں دیتے لیکن گر گر کر اٹھنے اور پھر وہی عمل دہرانے کا سبق تو ضرور دیتے ہیں اور ایک دن وہ بچہ بڑے جوتے میں پاؤں ڈال کر چلنے کے قابل ہو ہی جاتا ہے۔ مجھے یاد آیا میں بہت چھوٹی تھی تو جب مجھے نیا جوتا پہنایا جاتا مَیں اس کی اوپری خوب صورتی سے ذرا بھی محظوظ نہیں ہوتی۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد جوتا اتار کر اس کے نچلے حصّے کو دیکھتی جس پر مٹی جم چکی ہوتی۔ مَیں رونا شروع کر دیتی۔ ''جوتا گندہ ہوگیا ہے۔'' روتے روتے مَیں توتلی زبان میں یہ جملہ ادا کرتی۔

سب رشتے میرے گرد جمع ہوجاتے۔ کوئی سمجھاتا، چلنے سے جوتے گندے ہو ہی جاتے ہیں۔ دوسرا کہتا، لاؤ صاف کردیں۔

مَیں ضد کرتی۔ نہیں، اب یہ صاف نہیں ہوگا، یہ تو گندہ ہوگیا ہے۔ تب ایک رشتہ جو سب رشتوں میں سب سے بڑا تھا، جس کی گود میں جا کر مجھے اتنی سی عمر میں پناہ کا احساس ہوتا تھا۔ وہ آگے بڑھتا، میرے جوتے اٹھاتا، قریب کھڑی کسی ملازمہ کے ہاتھوں میں پکڑا دیتا اور میرے لیے فوراً ہی ایک نیا جوتا آجاتا۔ یہ عمل روزانہ دہرایا جاتا۔ نہ مَیں رونا بھولتی، نہ دوسرے رشتے دار مجھے دھوکہ دینا کہ جلد ہی مجھ سے چُھپا کر صاف کر دیتے اور نہ وہ گود مجھے مایوس کرتی جس کی گود میں پناہ تھی۔ نیا جوتا میرے پاؤں میں آجاتا۔

وہ سب کے جواب میں کہتا، بڑی ہوجائے گی، خود ہی سب سمجھ جائے گی۔ سمجھ آنے تک چند جوتے روز آ بھی گئے تو کیا بڑی بات ہے۔ اللہ نے اتنا تو دے ہی رکھا ہے۔ پھر ملازمین کے

بچوں کا بھلا ہو جاتا ہے اور میری بیٹی خوش ہو جاتی ہے، سو دا بُرا نہیں۔

ہاں وہ میرے ابا تھے جن کی گود مجھے پناہ لگتی تھی جب کہ مَیں جوتے کے تلے کی گرد کی حقیقت تک نہیں جانتی تھی۔

اس کے بعد ابھی مَیں بڑی بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ گود مجھ سے چھن گئی۔ مَیں نے ہر ضد چھوڑ دی جیسے کہ مَیں بڑی ہو گئی اور سمجھدار بھی۔ خود بہ خود یہ حقیقت سامنے آ گئی کہ کوئی خوشی پائیدار نہیں ہوتی۔ مل جائے تو اسے کس کر مٹھی میں چُھپا لو، نہ ملے تو آنکھوں میں آنسو بھی نہ آنے دو کہ مشیتِ ایزدی اسی کو کہتے ہیں۔

مَیں نے ساری عمر گود چھن جانے کا شکوہ اللہ سے تو کبھی نہیں کیا لیکن اپنے آپ سے یہ سوال ہمیشہ کیا کہ آخر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ ہر سوال کا جواب نہیں ہوتا۔ امتحان گاہ میں آنے والے پرچے کا یہ لازمی سوال تو تھا نہیں کہ مجھے اس کا حل ڈھونڈنا ہوتا۔ بقیہ سوال کے جواب تلاش کرتی رہی اور تب ہی یہ خواہش جاگی کہ مَیں زمانے بھر پہلے کے نقشِ قدم پر چلوں۔ خواہ وہ معدوم ہی ہو گئے ہوں۔ وہ نقشِ قدم سرحد پار رہ گئے تھے۔ خواہش تھی، وسائل بھی تھے مگر معاشیات اپنے ہی اصول ٹھکرا رہی تھی۔ آخر مشیّتِ ایزدی نے 19 مئی کو میرے ہاتھوں میں ویزا یا سپورٹ دے کر کہا، جاؤ اپنی اس دیرینہ خواہش کو پورا کرو جس پر آدھی صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔

بہت سارے وہ چہرے، وہ وجود، بھی وقت نے مجھ سے دور کر دیے تھے جو اُن نقشِ قدم کی کہانیاں مجھے سناتے رہے تھے۔ اب تو ان ادھوری کہانیوں کے کلائمکس تک مجھے خود ہی پہنچنا تھا۔

جہاز ہوا میں تھا اور ائر ہوسٹس وہ روایتی اونچائی بتا رہی تھی جہاں تک ہم سب مسافر پہنچ چکے تھے۔ ہماری منزل دلّی تھی۔ جس کے بارے میں سنتے اور پڑھتے رہے کہ ''ہنوز دلی دور است''۔ مگر دلّی تو صرف دو گھنٹے کی مسافت پر ہی تھی۔ ان دو گھنٹوں میں ڈھیر سارے الجھے الجھے خیالات نے ایک منٹ کے لیے بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔

ہر طالب علم کی طرح مَیں نے دلّی کی تاریخی اہمیت پڑھ رکھی تھی مگر مجھے نہ لال قلعہ یاد آیا۔ نہ جامع مسجد کی خوب صورت محرابیں، نہ قطب مینار، نہ مغلوں کے وہ تمام کارنامے جسے انہوں نے دلّی کے اندر اور باہر سرخ اینٹوں سے تحریر کر رکھا ہے۔ مَیں تو بس برسوں پرانے دلّی اسٹیشن کی

سیڑھیوں پر وہ نقشِ قدم ڈھونڈتی رہی جو علی گڑھ سے آتے اور واپس علی گڑھ جاتے ہوئے میری اوّلین اور آخری ''پناہ'' کے تھے۔

وہ کس راستے سے آئے اور گئے ہوں گے۔ کس کھڑکی سے ٹکٹ لیا ہوگا۔ کون سے قلی نے ان کا سامان اٹھایا ہوگا؟

مگر مَیں تو دلّی ایئرپورٹ پر تھی۔ قلی نہیں پورٹر میرا سامان ٹرالی میں رکھ رہا تھا۔ مَیں جامع مسجد کے گیٹ نمبر ایک تک پہنچ کر بمبئی اور ینٹ ہوٹل کے کمرہ نمبر 23 میں موجود تھی۔

مجھے اب بھی یقین نہیں تھا کہ مَیں نے وہ سرحد پار کرلی ہے جس کے لیے مَیں زندگی بھر سے انتظار کی کیفیت میں تھی۔

مَیں ناقابلِ یقین حالت میں جامع مسجد کی سیڑھیوں سے گزرتی ہوئی اس مقام تک پہنچی جہاں اب بھی صفیں بچھی ہوئی تھیں۔ نمازی خشوع وخضوع کی کیفیت میں تلاوت کر رہے تھے۔ کچھ کے ہاتھوں میں تسبیح تھی اور دانہ دانہ شمار کر رہے تھے۔

جانے وہ ہی ثواب سمیٹ رہے تھے یا اس قدیم جامع مسجد کے معمار بھی ثواب میں شامل تھے۔ ہاں وہ تو صدیوں پہلے بڑا کام کر گئے تھے اور رہتی دنیا تک یہاں کے منبر سے اللہ اکبر کی آواز گونجتی رہے گی۔ مَیں سرخ سرخ اینٹوں سے بنی اس مسجد کی چھت کی اونچائی دیکھ رہی تھی جس پر وقت گزرنے کا احساس تو جنم لیتا ہے لیکن یہ یقین بھی پختہ ہوجاتا ہے کہ اللہ اکبر کی آواز تاقیامت یوں ہی گونجتی رہے گی۔ پھر اس کی تعمیر میں حصّہ لینے والے بھلا جنّت میں اپنا مکان بنانے سے کیوں محروم رہیں گے کہ جس نے ایک بار اللہ اکبر کہا وہ تو اللہ کا پیارا ہو ہی گیا۔

بہت ساری اینٹیں دیواروں، سیڑھیوں اور چھتوں سے جدا ہوکر گر گئی تھیں جنہیں ایک جگہ جمع کر دیا گیا تھا۔ مَیں نے ان ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کے ڈھیر کی تصویر اپنے کیمرے میں محفوظ کرلی۔

میرے ساتھیوں نے پوچھا، تم نے ایسا کیوں کیا؟ سامنے دیکھو خوب صورت محراب ہے؟ مَیں انہیں کیا جواب دیتی۔ مَیں نے ان محرابوں کی تصویریں تو بارہا کتابوں میں دیکھی ہیں۔ ان ٹوٹی ہوئی اینٹوں کو تو اب کوئی دیکھتا بھی نہیں۔ یہ ٹوٹے ہوئے پتوں کی طرح ہیں۔ یہ مرجانے والے لوگوں کی قبروں کی طرح ہیں۔ جواب اپنی اپنی جگہوں کو چھوڑ گئے ہیں۔ بالکل اس طرح

جیسے ہمارے اپنے جو دنیا ہی چھوڑ گئے۔ہم انہیں بھول گئے۔بس آنے والے بچے ہی ہمارے کیمرے کی زد میں رہتے ہیں۔مَیں تو ہمیشہ ہی الٹا چلنے کی عادی رہی ہوں۔مَیں اگر انہیں یہ جواب دے بھی دیتی تو وہ میرے جواب سے کب مطمئن ہوتے؟

پھر ہم لال قلعہ،قطب مینار اور بہت ساری بے نام عمارتوں میں داخل ہوتے رہے، نکلتے رہے۔مَیں نے ان مغل بادشاہوں کے حضور سلام پیش کیا جنھوں نے مسلمانوں کے فنِ تعمیر کو دوام بخشا۔

پھر ہم خواجہ نظام الدین اولیا کے آستانے میں داخل ہوئے۔عقیدت مند اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ان پر وجد کی کیفیت طاری تھی۔وہ دنیا سے دور تھے اور اپنے آپ سے بے خبر تھے۔یہ دنیا اور ہی دنیا ہے۔تھوڑی دیر کے لیے مَیں بھی اسی میں جذب ہوگئی اور جب اس دنیا سے دور ہوئی تو واپسی پر پھر یہی سوچ میرا پیچھا کرتی پائی گئی۔میری اس ''پناہ'' نے بھی تو اپنے قدم یہاں رکھے ہوں گے جس کی گود مجھے سب سے زیادہ ٹھنڈی اور میٹھی لگتی تھی۔

تاریخ ایسے کسی نقشِ قدم کو محفوظ نہیں رکھتی لیکن مَیں سنبھل سنبھل کر اپنے قدم رکھ رہی تھی کہ نقش تو موجود ہوتے ہیں بس ہماری آنکھیں انہیں دیکھنے سے قاصر ہوتی ہیں۔

21 مئی کی صبح ایک وین کے ذریعے مَیں اس راستے کی طرف چل پڑی جس شہر کا ویزہ میری اوّلین ترجیح تھی۔مَیں پھر کہوں گی کہ میرے ساتھی اپنی دنیا میں تھے اور مَیں اپنی۔مَیں سب سے نظر بچا کر بار بار چشمے کا شیشہ صاف کرتی۔اپنی آنکھوں کی دھندلاہٹ دور کرتی جو بار بار آنسو امنڈ آنے سے دھندلا جاتی اور مَیں ساری ہوا، ساری فضا کو کُھلی آنکھوں سے بلا پلک جھپکے دیکھنا چاہتی تھی۔

''ان راستوں میں دفن ہیں میری خوشی کے پھول''

مَیں آپ ہی آپ راستوں سے مخاطب ہوئی۔غم کی شدت جب اپنے عروج پر ہوتی تو کہیں نہ کہیں خوشی اشارے میں ہم کلام ہوتی ہے۔خوشی کے اشارے میرے دل میں جا کر کہیں اپنی راہ بنا رہے تھے۔آنکھیں اپنا کام کر رہی تھیں اور دماغ اپنا۔مَیں بے بس اپنے جسم کے مختلف اعضا کے شکنجے میں تھی کہ وہ جگہ آ پہنچی جہاں کے لیے شاعر اپنی تمام تر ٹوٹ محبت لیے نغمہ سرا تھا۔

سرشار نگاہِ نرگس ہوں پابندِ گیسوئے سنبل ہوں
یہ میرا چمن ہے میرا چمن، مَیں اپنے چمن کا بلبل ہوں

اب ہم اسی چہاردیواری میں تھے جس چہاردیواری کی مقدس درسگاہ سے ہم نے ایک کلاس بھی پاس نہیں کی تھی۔ بلکہ روز ایک نیا جوتا پہننے کی خواہش کی تھی۔ بس یہیں کہیں وہ شفیق گود مجھ سے ہمیشہ کے لیے چھن چکی تھی، بس اسی چمن میں کہیں میری خوشی دفن ہوگئی تھی۔ بس اسی کی حسین ہواؤں اور فضاؤں میں وہ آواز ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی تھی جو روز مجھے لوری سناتی تھی۔ بس اسی جگہ پہلی بار مَیں نے اپنے سر سے کوئی سایہ سرکتا محسوس کیا تھا۔ بس یہیں کہیں وہ اب بھی موجود ہوگا جسے مَیں کئی دہائیوں سے ڈھونڈ رہی ہوں۔ صدی بدل گئی مگر وہ نہیں ملتا۔

یونی ورسٹی گیسٹ ہاؤس نمبر ایک کے کمرہ نمبر سات میں سامان رکھتے ہی میرے سارے جسم میں کرنٹ دوڑ گیا۔ اتنا انتظار، اتنا طویل انتظار آج مجھے یہاں لے ہی آیا۔ یہ شدید خواہش اور وسائل کا ملاپ تھا۔ معاشیات کا ایک اصول تھا جو پورا ہوا۔ مُیں نے بیگ سے سب سے پہلے ''افکارِ حسن'' نکالی جسے یہاں تک لانے میں مَیں نے اپنے بال سفید کر لیے اور اپنے سب بچوں کو ان کے بچے دے دیے۔ اپنی زندگی کے شب و روز ان پر قربان کر دیے۔ فرائض ادا کرتے کرتے مَیں بیٹی سے بیوی بنی، ماں بنی اور دادی تک بن گئی۔ مَیں نے اپنی زندگی کے چوبیس گھنٹوں میں سے پچیس گھنٹے اپنے گھر والوں کی جھولی میں ڈال دیے۔

اب عمر کی تھوڑی سی نقدی بچی تھی جسے چُھپا کر مَیں اپنی اس پناہ تک آئی تھی جس کی گود میں جا کر مجھے لگتا کہ میری ساری دنیا بس یہی ہے۔

مگر مَیں غلط تھی۔ میری اپنی دنیا تو تھی ہی نہیں۔ مُیں تو بس دوسروں کی دنیا میں تھی۔ تاہم یہاں آ کر اب مَیں اپنی دنیا میں آ گئی تھی۔

درجۂ حرارت 48 ڈگری تھا۔ ایسی گرم دوپہر کہ چیل بھی اپنا گھونسلا چھوڑ دے، مَیں نے گیسٹ ہاؤس چھوڑا۔ قبرستان کا پتا پوچھا۔ اگرچہ پیدل کا راستہ نہیں تھا اور گرم ہواؤں کی موجودگی میں تو ہرگز بھی نہیں تھا۔ مگر آج مجھے موسم کی شدت کی تو جیسے پروا ہی نہیں تھی۔ ''افکارِ حسن'' میرے ہاتھوں میں تھی اور مَیں دوڑتی بھاگتی کیمپس کی سڑک پر قبرستان کے راستے پر رواں دواں تھی۔ میرا

حلق خشک تھا، جوتے جل رہے تھے، سڑک آگ اُگل رہی تھی، دل دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ ذہن میں بس یہ تھا کہ اُن راستوں میں دفن ہیں میری خوشی کے پھول"۔

مَیں قبرستان میں داخل ہونے والی سڑک تک پہنچ گئی تب دائیں جانب ایک بورڈ نظر آیا جو ہدایت کر رہا تھا کہ یہاں آنے والے کون سی دعا کا وِرد کریں۔ یہ شعبۂ دینیات کے صدر کی ہدایت پر آویزاں کیا ہوا تھا۔ مَیں رک گئی، حوصلہ پیدا کیا، آنسوؤں کو پلک تک آنے سے رکنے کی ہدایت کی۔ مگر میرؔ نے کہا تھا۔

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے ہیں

میرا عشق سارے ادب آداب بھول چکا تھا۔ مَیں نے پوری زندگی جتنے بھی آنسو بہائے تھے اس موقع پر بہنے والے آنسوؤں کی مقدار ان سب سے کہیں زیادہ تھی۔

قبرستان میں جُھک جُھک کر مَیں ہر قبر کا کتبہ پڑھتی اور مایوس آگے بڑھ جاتی۔ چھ دَہائیوں بعد آنے والی ایک بدنصیب بیٹی اپنے باپ کو ڈھونڈ رہی تھی جس کے خدوخال بھی اس کی نظروں میں محفوظ نہیں تھے۔ جس نے تصویروں میں اپنے باپ کو دیکھا اور تحریروں سے اس کی شخصیت کو پہچانا۔ جس دو گز زمین تک پہنچنا اس نے اپنی زندگی کا مقصد بنا ڈالا تھا اور اس اپنے مقصد کو پانے میں اس نے اتنا عرصہ لگا ڈالا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کے ابا اس سے لاڈ کر رہے ہیں، اسے ستا رہے ہیں۔ چُھپنے چُھپانے کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ شاید وہ مزے لے رہے ہیں اور سامنے نہیں آ رہے ہیں۔ وہ قبروں قبروں جُھک جُھک کر انہیں ڈھونڈ رہی ہے، اُن کی بیٹی دکھ سے مری جا رہی تھی۔ وہ تو مایوس ہوتی جا رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی شاید اس کے رہنے تک کی مدت ختم ہو جائے گی اور اس کے ابا بس لاڈ ہی کرتے رہیں گے، یا سزا دیتے رہیں گے کہ تُو نے آنے میں اتنی دیر کیوں لگا دی......؟

کئی گھنٹے گزر گئے، ایسے ہی جیسے آدھی سے زیادہ صدی گزر گئی۔ آنسو بہتے بہتے رک گئے۔ پاؤں چلتے چلتے تھک گئے۔ جوتے نیچے سے ہی نہیں اوپر سے بھی مٹی سے بھر گئے۔ کتنی ہی نوکیلی جھاڑیوں نے پاؤں خون بھی کر دیے۔ آس اور امید بھی ختم ہو گئی۔

"امید" پر معرکتہ الآرا مضمون لکھنے والا اس شہر کا مہربان سر سیّد احمد خان سامنے آ کھڑا ہوا۔

امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔ چھوٹی کلاسوں میں پڑھا ہوا اس کا یہ بڑا مضمون میرا رہبر بن گیا۔ تب مَیں نے ٹھہری آواز میں کہا۔ ''کہاں چلے گئے ابا؟ مَیں تو میلوں دور سے آئی ہوں۔ صدیاں گزار کر آئی ہوں۔ آنے میں دیر کی ہے۔ پر آئی تو ہوں اب تو مل جایئے۔''

مگر زمانے نے پرانی قبروں پر جھاڑیاں اگا دی تھیں۔ گرد نے پہرہ بٹھا دیا تھا۔ اُن کا اَن دیکھا چھوٹا سا گھر نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔

میرے ساتھیوں نے میرا پیچھا کیا تھا۔ وہ سب بھی آ گئے۔ سب نے ڈھونڈا مگر وہ کسی کو بھی نظر نہیں آئے۔

اور جب مَیں مایوس ہو کر گیسٹ ہاؤس کی طرف لوٹ رہی تھی تب کفر کا ایک جملہ میرے ذہن میں گناہ بن کر گونجا۔

''زندگی میں تو اللہ تُو نے انہیں چھین ہی لیا تھا۔ اب ان کی قبر بھی نظروں سے اوجھل کر دی۔ اللہ یہ ہے تیرا انصاف؟''

گناہ کی آواز انسان کو ذلیل کر دیتی ہے۔ مَیں نے جلد ہی توبہ کی اور پھر سے اپنی آس کو زندہ کیا۔ کل کے اجالے میں ایک بار پھر مَیں انہیں ڈھونڈنے نکلوں گی۔ اس بار اللہ کی موجودگی اور اس کے انصاف نے مجھے یقین دلایا اور شہرِ علی گڑھ کے محسن سر سیّد احمد خان نے پھر ''امید کی خوشی'' کا سبق پڑھایا۔

وہ رات غضب کی رات تھی۔ مَیں سو رہی تھی۔ کہتے ہیں، سوتا ہوا شخص مردہ ہوتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے، جب نیند سے جاگو تب خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے آج کے لیے پھر سے زندگی دے دی۔

مَیں نیند میں بھی اپنے آپ سے مخاطب تھی۔ چند گز کے فاصلے پر زمین کے بستر پر میرے ابا محوِ خواب ہوں گے۔ مَیں یہاں بستر پر ہوں۔ تھوڑا سا ہی تو فاصلہ ہے۔ ہم دونوں مل کیوں نہیں جاتے؟ ساری عمر تو میلوں کی دوری تھی اب ''امن کی آشا'' نے آشا جگا دی ہے۔ ملاقات کیوں نہیں ہوئی؟ جاگتے سوتے رات گزر گئی۔ فجر کی نماز میں صرف ایک ہی دعا یاد تھی۔ دعا مانگ کر اُسی راستے پر چل پڑی۔ آج ارادہ تھا، پکا ارادہ۔ ڈھونڈ کر ہی آؤں گی۔ لوہے کا گیٹ عبور کیا۔

دائیں جانب مسجد تھی۔ آج سفر دائیں جانب سے شروع کرنا تھا۔ قبر کے کتبے کا رخ الٹا تھا۔ جب تک آخری دیوار تک پہنچ کر نہ دیکھیں کتبے نظر نہیں آئیں گے۔ چھوٹا سا راستہ ڈھونڈ، احتیاط سے پاؤں رکھتی کنارے تک پہنچی۔ اب کتبے نظر آرہے تھے۔ لیکن وقت کی گرد تلے تحریر دب چکی تھی۔ ''کیا تمام قبروں کے کتبوں کی صفائی کروں؟'' مشکل ہے بہت مشکل، کچھ پر شک گزرا، ٹھہر گئی۔ پھر آگے بڑھ گئی اور پھر بے اختیار رونے لگی۔ ایک جگہ کھڑے ہوکر اپنے ابا سے مخاطب ہوئی، با آوازِ بلند۔

''یہ تو اچھی بات نہیں ہے ابا۔ کل بھی آئی تھی، آج بھی آئی ہوں۔ آپ ملنا ہی نہیں چاہتے۔ پرسوں چلی جاؤں گی۔ کیا یہ انصاف ہے؟ مَیں جب آپ کو محسوس کرنے کے قابل ہوئی آپ یہاں آکر چھپ گئے۔ میری ساری زندگی کو انتظار دے گئے۔ آج جب وہ انتظار ختم ہوا ہے تب آپ پھر میرے ساتھ ناانصافی کر رہے ہیں۔ ابا یہ اچھی بات نہیں ہے۔'' مَیں اب زور زور سے بول رہی تھی۔

''مَیں بہت دور سے آئی ہوں۔ مجھ سے مل لیں۔ پلیز ابا، پلیز۔ رفیق گورکن میری آواز سن کر آ گیا۔ اس نے کل بھی میری مایوسی دیکھی تھی اور آج کے نالے بھی سُن رہا تھا۔ اس کے دن رات قبرستان میں گزرتے ہیں۔ وہ دوسروں کے درد کو شاید زیادہ سمجھتا تھا۔ میرے ساتھ وہ بھی پریشان تھا۔ وہ میری کہانی جانتا تھا۔ مَیں نے اسے بتا دیا تھا کہ مَیں کتنے سالوں بعد یہاں آئی ہوں۔ شاید میرے نالوں کے ساتھ اس کی دُعا بھی شامل ہوگئی۔

جیسے کسی نے چپکے سے میرے کان میں کہا۔ ''آ جاؤ مَیں یہاں ہوں۔ مَیں بس پاس ہی میں ہوں۔''

مَیں ایک قبر کے کنارے بیٹھ گئی۔ جس پر بے شمار جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ جس کے پتھر کی سِل کالی ہوچکی تھی اور جس کے کتبے پر مٹی دھول کی اتھاہ تہہ جمی ہوئی تھی۔ مَیں نے کسی غیبی اشارے کے تحت ہاتھ میں دبے اس ٹشو پیپر سے صاف کرنا شروع کر دیا جس میں میرے آنسو جذب ہی نہیں بہہ رہے تھے۔ ابھی ایک لفظ ہی صاف ہوکر سامنے آیا تھا کہ میری چیخ اس قبرستان میں بلند ہوئی۔ شاید کوئی کبھی یہاں اتنی زور سے چیخا نہ ہوگا اور میری عمر کا تو ہرگز بھی نہیں۔ بس یہی

دو گز زمین تھی جہاں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے اسٹیوارڈ رشید احمد صدیقی کے لاڈلے شاگرد اور گنج ہائے گرانمایہ کی نامور شخصیت حسن عبداللہ سوئے ہوئے تھے۔ جو مولوی ابوالحسن انڈین ایجوکیشن سروس سے متعلق اور مسلم یونی ورسٹی کے ممبر کورٹ، نواب وقارالملک کے سیکریٹری ڈیوٹی سوسائٹی کے انچارج اور کشمیر اسٹیٹ کے ڈائریکٹر ایجوکیشن کے اکلوتے بیٹے تھے اور جو اس دنیا کو صرف چالیس برس کی عمر میں چھوڑ کر یہاں سو گئے تھے۔ جس خاموش بستی کو یہاں کے طالب علموں نے ''منٹو۔ای'' (MINTO-E) کا نام دے دیا تھا یعنی یہ سوتے ہوئے لوگوں کا ہوسٹل تھا۔

سورج پوری طرح نکل آیا تھا۔ گرمی اپنا زور دکھانے پر تُلی ہوئی تھی۔ مَیں یک ٹک اس تختی کو دیکھ رہی تھی جسے ابھی ابھی مَیں نے اپنے آنسوؤں سے صاف کیا تھا۔ جہاں تک پہنچنا میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو تھی۔ آج وہ آرزو پایۂ تکمیل تک تو پہنچ گئی۔ لگا اب تو زندگی میں کرنے کو کچھ بچا ہی نہیں۔ مَیں نے ان کی وہ کتاب جسے وہ چھوٹی سی ڈائری میں اپنے قلم سے بند کر گئے تھے اور جسے مَیں نے ترتیب دے کر ایک کتاب کی صورت دے دی تھی اور جانا تھا کہ بیٹی ہونے کا ایک فرض تو مَیں نے ادا کر دیا ہے، ان کے سرہانے رکھ دی۔ جیسے یہ سرہانا نہیں لائبریری کی ٹیک شلیف ہو۔

مَیں پھر ان سے مخاطب تھی۔ ابا مَیں تو آپ کے پاؤں بھی کبھی نہیں دبا پائی۔ مَیں نے تو کبھی آپ کو پانی کا گلاس بھی نہیں تھمایا، مَیں نے آپ کے پیروں میں کبھی جوتا بھی نہیں پہنایا جو تین چار سال کے بچے ضرور یہ چھوٹے چھوٹے کام کر کے اپنا قد بڑا کرتے ہیں۔ جب آپ اس دنیا سے روٹھ گئے تب مَیں نے لکھنا پڑھنا سیکھا اور پھر آپ کی یہ کتاب مرتّب کی ورنہ آپ کا قابلِ قدر کلام دُھند میں کہیں چُھپ جاتا۔ شاید آپ مجھ سے یہ کام ضرور لینا چاہتے تھے جب ہی تو روز میرے کان میں سب سے چُھپ کر کہتے۔ ''بیٹا حرف چھپنے کے لیے ہوتے ہیں مٹنے کے لیے نہیں۔'' مَیں اِدھر اُدھر دیکھتی، کون یہ کہتا رہتا ہے مجھ سے؟ ابا آپ کی آواز مَیں پہچانتی تو نہیں تھی مگر بس سمجھ بیٹھی کہ یہ آپ ہی ہوں گے۔ پھر مَیں نے اپنی سمجھ اور پہنچ کے مطابق یہ کام کر ڈالا۔ اپنا کارنامہ آپ تک پہنچانا چاہتی تھی مگر سرحد کے دونوں پار ہمیشہ ہی ایک کشمکش رہتی ہے۔ مَیں آپ

تک دیر سے پہنچی۔ آپ کی اور جانے کتنی تحریریں رہی ہوں گی جسے ایک ہجرت نے مٹا دیا، گم کر دیا۔ بہت ساری چیزوں کو، تحریروں کو، تصویروں کو، نام ونشان تک کو مٹا ڈالا۔ ابا ہجرت اسی کو کہتے ہیں۔

ابا ہجرت پر ہم مجبور نہیں تھے، ہجرت پر ہم مامور تھے۔ سو ہم نے یہ فریضہ انجام دیا۔

مَیں بولے جا رہی تھی۔ بے تکان بول رہی تھی۔ اتنے سارے سالوں کی آواز جو سینے میں دبی تھی۔ اب مجھے کون چُپ کرا سکتا تھا۔ الفاظ تو ختم ہو چکے تھے، احساس کی زبان اب بھی رواں تھی۔ کتنا وقت گزرا پتا نہیں۔ جدائی تھی بھی تو طویل۔ ملاپ طویل کیوں نہ ہوتا؟

مَیں جب ابا کی آرام گاہ سے لوٹ رہی تھی، میرے دل کو قرار آ گیا تھا۔ مدتوں کی تلاش پوری ہو گئی تھی۔ مَیں نے حاضری کے رجسٹر پر اپنا نام لکھ دیا تھا۔ سورج کی تپش نے میرا کچھ نہیں بگاڑا۔ میری برسوں کی آرزو سے وہ ہار چکا تھا۔ مَیں جیت گئی تھی۔ ایک بڑی ریس میں مَیں مدتوں سے دوڑ رہی تھی، دوڑ رہی تھی اور اب وکٹری اسٹینڈ پر کھڑی تھی۔ مگر میرے آنسو اب بھی بہہ رہے تھے۔ یہ بھی کوئی ملاقات تھی۔ نہ ابا کے بازو پھیلے، نہ مَیں ان بازوؤں کے حصار میں آئی۔ نہ مَیں نے اپنے سر پر چھت محسوس کی نہ میرے سینے کی جلن میں کوئی افاقہ ہوا اور نہ انہوں نے اپنی خاموشی توڑی۔

مگر مَیں نے پھر بھی اپنے اللہ کا شکر ادا کیا۔ 22 مئی 2014ء میری ان کی ملاقات کا پہلا دن تھا جو گزر گیا۔ لیکن علی گڑھ کے قیام کے تین دنوں میں سات مرتبہ میری خاموش ملاقات ابا سے ہوئی۔ ہر بار کلام فاتحہ سے ہوتا۔ آنسو بہتے، قبر کی صفائی ہوتی۔ رنگ کیا، کتبے کا منہ دھلایا۔ پودا لگایا اور پودے سے وعدہ لیا۔ ''مرجھانا نہیں، سایہ بن جانا، پھول نکالنا اور میرے ابا کا خیال رکھنا۔'' رفیق کو بھی ہدایت کی، اس سے وعدہ لیا۔ ایسے جیسے لڑکیاں میکے سے جاتے ہوئے چھوٹے بہن بھائیوں کو ابا اماں کا خیال رکھنے کی ہدایت کر کے جاتی ہیں۔

سات پھیرے قبرستان کے ختم ہوئے کہ تین دنوں میں بس اتنا ہی ہو سکتا تھا۔ واپسی پر ایک چھوٹی سی قبر راستے میں آ گئی جس کے کتبے پر ماں باپ نے اپنے خون سے لکھا تھا۔ ''گمنام ہی رہنے دو، مرا نام یہی ہے۔''

مجھے اپنے پوتے کی بے اختیار یاد آ گئی جس نے دنیا میں صرف ایک دن ہی سانس لی تھی اور اپنے پَردادا کے پہلو میں جا سویا تھا اور جس کی لحد پر ہم نے لکھ دیا ہے۔

''پَردادا کی گود میں ہوں۔ محفوظ ہوں''

مَیں جب علی گڑھ سے چلی تو دیگر ہوسٹل کے علاوہ منٹو۔اے، بی، سی، ڈی کے جاگتے مکینوں کو خاموش سلام پیش کرتے ہوئے ''منٹو۔ای'' کے خاموش مکینوں کو با آوازِ بلند سلام پیش کر رہی تھی جہاں بڑے بڑے صاحبانِ علم اور عاشقانِ درسگاہ محوِ خواب ہیں۔

❑

غالبؔ کے شہر دہلی میں

دہلی سے علی گڑھ روانہ ہونے میں ابھی چند گھنٹے باقی تھے۔ دہلی یونی ورسٹی سے پروفیسر ارتضیٰ کریم کا فون بار بار آ رہا تھا کہ آپ کو یونی ورسٹی آنا ہے۔ اگرچہ آج کل بند ہے لیکن شعبے کے اساتذہ آپ کے منتظر ہیں۔ ارتضیٰ کریم صاحب سے متعلق مَیں آپ کو یہ بتادوں کہ وہ پچھلے سال آرٹس کونسل کراچی کی عالمی اردو کانفرنس میں شرکت کے لیے کراچی تشریف لائے تھے۔ میری ملاقات ان سے ہوئی اور مَیں نے انہیں ''افکارِ حسن'' جو میرے والد کا مجموعہ کلام ہے، جسے مَیں نے ان کے انتقال کے تقریباً پچاس سال بعد مرتب کیا ہے۔ انہیں یہ کہہ کر پیش کی کہ آپ کے سامان میں یہ کتاب زیادہ وزن کی ذمہ دار نہیں ہوگی۔ لیکن آپ اگر اسے اپنے ساتھ ہندوستان لے جائیں گے تب مَیں صرف اس لیے خوش ہوں گی کہ ان کا کلام ان کے شہر پہنچ گیا۔ اگر آپ اسے علی گڑھ نہ بھی پہنچائیں تو دہلی یونی ورسٹی کی لائبریری میں امانتاً رکھوا دیں۔

شاید انہیں میری یہ مجنونانہ گفتگو یاد تھی اور میرے دہلی آمد پر انہوں نے مجھے یاد کیا۔ مگر باوجود چاہنے کے میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ مَیں یونی ورسٹی جا کر نہ صرف ان سے بلکہ دیگر اساتذہ کرام سے ملاقات کا شرف حاصل کر پاتی۔ ہاں مَیں نے وعدہ کیا کہ واپسی پر پاکستان جانے سے قبل جب پھر دہلی آؤں گی تب ضرور ملاقات کروں گی اور یہ میرے پروگرام میں بھی شامل ہے۔ علی گڑھ روانگی میرے جسم میں خون کی گردش تیز کر رہی تھی۔ یہ برسوں کی آرزو تھی جو پوری ہونے جا رہی تھی۔ مگر ابھی چند گھنٹے میرے پاس تھے اور مَیں نے اپنے میزبانوں سے غالبؔ

اکیڈمی دیکھنے کی خواہش کی۔مَیں بَلّی ماراں جانا چاہتی تھی جہاں ایک بنجارہ غالبؔ کی غزل گاتا ہوا ان کی گلی سے گزرتا تھا۔

دہلی میں سائیکل رکشا میرے ضبط کا امتحان لے رہا تھا۔ جامع مسجد کے علاقے کی تنگ گلیوں میں پکوان، مختلف اشیاء کی دکانوں، بھکاریوں کی کثیر تعداد اور سائیکل رکشا کی دوطرفہ آمدورفت ہولناک سماں پیش کر رہی تھی۔ پیدل چلنا دشوار تھا۔ جانے لوگ کس مشاقی کے ساتھ اِدھر سے اُدھر ہو رہے تھے۔ پھر رکشا جسے سخت گرمی میں ایک انسان، دو تین انسانوں کے بوجھ کو گھسیٹ کر منزلِ مقصود تک لیے پھر رہا تھا، میرے دل کو خون کے آنسو رلا رہا تھا۔ مَیں نے کھڑے ہو کر ڈھیر سارے رکشا چلانے والوں کو دیکھا۔ ان میں سے ہر ایک دبلا پتلا بلکہ لاغر ہی نکلا۔ ہر ایک کا چہرہ بلکہ بدن تک سیاہ ہو چکا تھا۔ ہر ایک نامکمل لباس میں تھا اور ہر ایک کے چہرے پر مفلسی، بے بسی اور تکلیف کی کہانی پڑھی جا سکتی تھی۔ مَیں نہیں جانتی مگر مَیں یہ عقلی طور پر تسلیم کر چکی تھی کہ وہ سب اب تک دل، گردے یا جسمانی کسی نہ کسی مرض میں ضرور مبتلا ہو چکے ہیں۔ مَیں نے پہلے تو اللہ کا شکر ادا کیا کہ بہت پہلے ہمارے ملک سے یہ سواری ختم ہو چکی ہے۔ یہ انسان کی تذلیل اور طبقاتی نظام کی ایسی بدترین مثال ہے کہ اسے ہندوستان سے بھی فوراً ختم ہو جانا چاہیے۔ مَیں نے یہ دعا دل کی گہرائی سے مانگی۔

اسی سوچ کے ساتھ رکشا کی سواری سے مَیں نے معذرت کر لی۔ کم از کم مَیں اپنا بوجھ ان پر لادنا نہیں چاہتی تھی۔ لہٰذا خاصا دور پیدل چل کر جب ذرا کھلی سڑک آئی تب ٹیکسی دستیاب ہوئی اور ہم بَلّی ماراں کی گلی میں غالبؔ کے گھر پہنچ گئے۔

بَلّی ماراں کی پتلی سی گلی کے نکڑ پر بورڈ آویزاں تھا۔ جانے یہ غالبؔ کے زمانے میں بھی لگا تھا یا نہیں۔ مگر گلی شروع ہوتے ہی بائیں جانب دوسرا یا تیسرا مکان غالبؔ صاحب کا تھا جو اب ''غالبؔ اکیڈمی'' کا نام پا چکا ہے۔

سیڑھیوں پر دو چار لوگ بیٹھے کچھ کھا رہے تھے اور کچھ اونگھ رہے تھے اور اکیڈمی کے مرکزی دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ ہمیں مایوسی ہوئی، اِدھر اُدھر دیکھا تب ایک بورڈ نظر آیا جس پر تحریر تھا کہ اسے دیکھے جانے کے اوقات گیارہ بجے سے شام چھ بجے تک تھے اور پیر کے روز یہ بند رہتا ہے۔

آج پیر نہیں تھا لیکن ہم صبح 10 بجے وہاں پہنچ گئے تھے۔ مزید ایک گھنٹہ انتظار ممکن ہی نہیں تھا مگر ہمارے میزبانوں میں سے ایک نے بڑھ کر چوکیدار کو ڈھونڈ نکالا جو اُن ہی چند لوگوں میں سے ایک تھا جو سیڑھیوں پر بیٹھا مسلسل منہ چلا رہا تھا۔ یہ پتا نہیں چلا کہ وہ کیا کھا رہا تھا۔

دروازہ کب کھلتا ہے؟ اوقاتِ کار جاننے کے باوجود ہمارے ایک میزبان نے اس سے پوچھا۔

جناب گیارہ بجے وہ صاف اردو میں بولا۔

کیا تم ابھی تالا کھول سکتے ہو۔ ہم بہت دور سے آئے ہیں اور ابھی ہمیں واپس بھی جانا ہے۔

اس نے بغور ہمیں دیکھا۔ میزبانوں کو نہ سہی مگر مجھے وہ ضرور بدیسی سمجھا اور مہربانی برتی۔ تالا کھولنے پر آمادہ ہوگیا۔ ہم نے تشکر کے طور پر اسے کچھ دینا چاہا جو اس نے لینے سے صاف انکار کردیا۔ ہم اس کے جذبے سے بہت متاثر ہوئے کہ اس نے ہماری میزبانی کیا خوب کی کہ وقت کی بھی پروا نہیں کی اور کچھ انعام بھی طلب نہیں کیا۔

ہم نے عادتاً اس کا انٹرویو لینا چاہا

تم غالبؔ کے بارے میں کیا جانتے ہو؟

صاحب ہم کچھ نہیں جانتے۔ مگر اتنا جانتے ہیں کہ یہ بڑے آدمی تھے، اسی مکان میں رہتے تھے۔ اب سرکار نے اسے اپنے قبضے میں لے لیا ہے اور لوگ دور دور سے ان کے گھر اور ان کی تصویریں دیکھنے یہاں آتے ہیں۔ اس نے اپنی معلومات سے ہمیں آگاہ کیا۔

ہم نے بھی اس کی معلومات میں اضافے کی ٹھانی۔ یہ ایک بہت بڑے شاعر کا گھر ہے۔ اردو اور فارسی زبان کے شاعر کا۔

پھر ہم نے پلٹ کر اس سے دوسرا سوال کردیا۔ جانتے ہو شاعر کون ہوتا ہے؟

وہ مسکرایا۔ اتنا تو ہم جانتے ہیں۔ جو شعر کہتے ہیں وہ شاعر ہوتے ہیں۔

ہاں جو شعر کہتے ہیں وہ شاعر ہوتے ہیں اور جو بہت اچھا شعر کہتے ہیں وہ بڑے شاعر ہوتے ہیں۔ ہمارے غالبؔ صاحب بہت بڑے شاعر تھے۔ ہم نے باقاعدہ لیکچر دیا۔

جب ہی تو سرکار نے ان کے گھر میں ان کی تصویریں لگا کر تالا بند کردیا ہے۔ وہ اب غالبؔ

کی عظمت کو پہلے سے زیادہ سمجھ چکا تھا اور اب ہم بھی مطمئن تھے کہ ہم نے اپنی پروفیسری کا حق ادا کر دیا۔

دہلی گورنمنٹ نے بھارتی کونسل برائے ثقافت کی مدد سے یہ ادارہ قائم کر کے بلّی ماراں کی تیلی سی گلی کے چھوٹے سے گھر کو ادب و ثقافت کا بڑا درجہ دے دیا ہے۔ ہم نے دل ہی دل میں کونسل اور بھارت سرکار دونوں کی تعریف کی اور جلدی جلدی دو چار سیڑھیاں چڑھ کر اس مکان میں داخل ہو گئے جس پر جلی حروف میں غالبؔ اکیڈمی تحریر ہے۔

ایک طرف غالبؔ کی سوانح حیات تحریر تھی تو دوسری طرف امراؤ بیگم کی رودادِ حیات۔ ایک دیوار پر آگرے کے مکان کا نقشہ تھا تو دوسری دیوار پر مراد آباد کی حویلی کی تصویر۔ ہر طرف ان کے اشعار سے دیواریں سجی ہوئی تھیں۔

ایک جگہ رالف رسل کا اعتراف تحریر تھا۔

''اگر غالبؔ انگریزی زبان کے شاعر ہوتے تو تمام زبانوں کے ہی نہیں بلکہ رہتی دنیا کے عظیم ترین شاعر ہوتے۔''

رالف رسل کا یہ اعتراف ہمیں اچھا لگا لیکن ہم اس تحریر کے روبرو کھڑے ہو کر رسل صاحب کو اپنے خیالات سے بھی آگاہ کرنا چاہتے تھے۔

''غالب نے خواہ اردو میں خواہ فارسی میں شاعری کی ہو، وہ اب بھی دنیا کی تمام زبانوں کے شاعروں سے بڑے شاعر ہیں اور یقیناً رہتی دنیا تک عظیم شاعر ہی مانے جاتے رہیں گے۔''

اپنی اس دوسری تقریر کے بعد ہم نے ان کے زمانے میں استعمال ہونے والے برتن دیکھے۔ وہ انگرکھا بھی دیکھا جو بوسیدگی کی حد پار کر چکا تھا اور دیوار پر یوں لٹکا ہوا تھا کہ کبھی یہ غالبؔ کے بدن پر سجا رہتا تھا۔ حقیقت تو اللہ جانے یا تاریخ دان مگر ہم نے اس انگرکھے کو بڑی دلچسپی سے دیکھا بلکہ چھوا بھی اور اس کے ڈیزائنر اور ٹیلر تک کو داد دی۔

ایک طرف ایک رنگین تصویر غالبؔ صاحب کے اطمینان اور فرصت کے اوقات ظاہر کر رہی تھی۔ ''رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے''

میرے ذہن میں تصویر دیکھتے ہی یہ مصرع گونجا۔ اگر چہ ان کی گود میں ادھ کھلی کتاب یا رجسٹر

تھا اور ایک ہاتھ میں قلم اور دوسرے میں حقہ۔ ایک جگہ ان کے قلمی دیوان کا نسخہ تھا جس کا صفحہ نمبر 557 کھلا ہوا تھا جس پر ان کی مشہور غزل ان کی اپنی تحریر میں تھی۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

غالبؔ کے پسندیدہ شوق پتنگ بازی، چوسر اور شطرنج تھے۔ یہاں چوسر کی بساط بچھی ہوئی تھی۔

دیواروں پر مرزا کے مختلف پوز تھے۔ ایک تصویر کے نیچے تحریر تھا۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

مَیں نے غالبؔ کے پورٹریٹ کے ساتھ کئی تصاویر بنوائیں۔

غالبؔ کے ساتھ میرا ایک رشتہ تو بنتا ہی ہے کہ جب 1862ء میں سرسیّد احمد خان صدر الصدور کے عہدے پر فائز ہو کر غازی پور آئے تب انہیں یہاں ایسے نوجوانوں کی تلاش تھی جو ان کے تعلیمی مشن میں تعاون کر سکیں۔ انہیں بہت ساری خوبیاں صمد صاحب کی شخصیت میں نظر آئیں۔ صمد صاحب کے والد مولوی محمد صدیق جن کا شمار غازی پور کے اعلیٰ زمیندار گھرانے سے تھا، علوم مشرقی کے ساتھ انہوں نے علوم مغربی بھی امتیازی حیثیت سے حاصل کئے تھے۔ غازی پور کے جرمن مشن ہائی اسکول جو اب گورنمنٹ انٹر کالج بن چکا ہے، میں انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر الہٰ باد چلے گئے اور ایونگ کرسچین کالج بعد میں الہٰ باد یونی ورسٹی سے قانون کی سند حاصل کی اور واپس آ کر اپنے شہر غازی پور ہی میں سکونت اختیار کی اور وکالت کا پیشہ اپنایا۔ بڑی محنت اور ایمانداری سے وکالت میں بڑا نام پیدا کیا۔ بس ان ہی دنوں سرسیّد سے ان کی ملاقات ہوئی۔ سرسیّد خود غازی پور کے ان کے مکان ''صمد منزل'' میں بارہا ان سے ملاقات کے لیے آنے لگے۔ دراصل سرسیّد کا مشن یہ تھا کہ وہ دینی علوم کے علاوہ انگریزی تعلیم کی افادیت سے بھی لوگوں کو روشناس کرانا چاہتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے مدرسہ ملکہ وکٹوریہ 1864 میں قائم کیا جس کے بارے میں ''حیاتِ جاوید'' میں حالیؔ نے لکھا بھی ہے۔ بعد میں جب سرسیّد کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا

تب بھی سرسیّد کا رشتہ صمد صاحب سے نہیں ٹوٹا اور ان کے درمیان با قاعدہ خط و کتابت ہوتی رہی۔ صمد صاحب نے غازی پور سے سرسیّد کے مشن کے سلسلے میں مالی تعاون بھی کیا جو تاریخ میں محفوظ ہے۔ سرسیّد نے ایک خط میں لکھا کہ آپ جب بھی علی گڑھ آئیں، میرے مہمان بنیں۔ انہوں نے صمد صاحب کی ارسال کردہ کتابوں، تین عدد قلمی نسخوں کا بھی ذکر کیا جو شاہ فرید عالم کلکشن کے نام سے آج بھی مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں محفوظ ہیں۔

عبدالصمد صاحب نامی گرامی وکیل کے علاوہ اپنے وقت کے پائے کے شاعر بھی تھے۔ غزل کے علاوہ نثر بھی خوب لکھتے تھے اور جناب آسی غازی پوری سے شرفِ تلمذ بھی حاصل تھا۔

''ساعت الاخیار'' میں درج ہے کہ صمد صاحب اپنا کلام آسی صاحب کو دکھاتے تھے اور داد وصول کرتے تھے۔

''خم خانۂ جاوید'' میں لالہ سری رام نے ان کی غزلوں کو شائع بھی کیا ہے۔

آسی غازی پوری نے غالب کی غزلوں پر اکثر غزلیں کہی ہیں۔ مولوی عبدالصمد صاحب جب دہلی گئے اور شاید اسی گھر میں گئے ہوں جہاں آج میں کھڑی تھی، وہ غزلیں غالبؔ کو سنائیں۔ ''عین العارف'' کے مطابق غالبؔ دم بخود سنتے رہے اس کے بعد فرمایا کہ اللہ اللہ ایسے لکھنے والے اب بھی ہندوستان میں موجود ہیں۔

مولوی عبدالصمد میرے پردادا ہیں۔ سرسیّد اور بعد میں غالبؔ سے ان کا تعلق تاریخ کے اوراق میں دفن ہے۔ مَیں جب بھی ماضی میں جھانکتی ہوں تب اپنے آباء و اجداد کی علمیت، قابلیت اور ان کے قائم رہ جانے والے کام کا مطالعہ کرتی ہوں تو اپنے اندر فخر و غرور کا سمندر موجزن پاتی ہوں۔ اور اپنے آپ سے سوال کرتی ہوں۔ '' تھے تو آبا وہ تمہارے ہی مگر تم کیا ہو؟''

یہ سوال اکثر مجھے شرمندہ کرتا ہے۔ ہم نے زندگی تو گزاری ہے مگر صرف اپنے عہد میں جینے کے لیے۔ تاریخ کے اوراق میں زندۂ جاوید ہونے کے لیے جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے وہ ہمیں نہیں آتا۔ میرے والد نے اپنی زندگی کا آخری شعر یوں کہا۔

ہم زندگی کے واسطے مر جائیں گے حسنؔ
جب اور کوئی زیست کا ساماں نہ کر سکے

ہندوستان کا سفر میری زندگی کے ابتدائی سالوں سے شوق کے زمرے میں آتا تھا۔اب جبکہ زندگی کی شام ہونے کو آئی ہے،مَیں ہندوستان میں موجود تھی۔اپنے آباءواجداد کے نقشِ قدم تلاش کرنے کے لیے۔غالبؔ سے اپنے ذاتی تعلق کا اعادہ کرنے کے بعد ہم علی گڑھ کے لیے روانہ ہوگئے جہاں میرے والد یونی ورسٹی میں اسٹیوارڈ کے عہدے پر فائز تھے اور کیوں ان کا تقرر بطورِ خاص کیا گیا تھا؟ گنج ہائے گرانمایہ میں رشید احمد صدیقی نے واضح کیا ہے۔

اسی شہرِ علی گڑھ میں میرے دادا ممبر کورٹ اور محسن الملک وقار الملک کے سیکریٹری اور نواب مزمل اللہ اور نواب اسحٰق خان جیسی شخصیات کے رفیقِ خاص تھے۔

جہاں میرے پردادا مولوی عبدالصمد کا نام مسلم یونی ورسٹی کے ایک گیٹ پر آج بھی لکھا ہوا ہے جو ان کی خدمات کی یاد دلاتا ہے۔ان ہی عبدالصمد صاحب کو جنہیں سرکار نے ''سر'' کا خطاب بھی عطا کیا تھا اور جسے انہوں نے جذبۂ حب الوطنی کے سبب شکریے کے ساتھ واپس کر دیا تھا کہ وہ انگریز حکومت سے اپنے ہی ملک کی زمین اور خطاب لینے کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔

مَیں اُس چمن کی طرف دیوانہ وار بڑھ رہی تھی جہاں چہار سو اُن کی تین نسلوں کی خدمات بکھری ہوئی ہیں۔

❑

ڈھائی دن علی گڑھ میں

ہم سب دہلی سے علی گڑھ کی طرف رواں تھے۔ اوروں کے ذہنوں میں کیا تھا مجھے نہیں معلوم لیکن میرا ذہن گاڑی سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ مَیں صرف دو برس کی تھی جب علی گڑھ کی زمین مجھ سے چھن گئی۔ اتنا چھوٹا بچہ بمشکل اپنے قدموں پر اعتماد کے ساتھ چلتا ہے، سومَیں جانتی تھی کہ میرے نقشِ پا اس شہر میں موجود ہی نہیں۔ لیکن مَیں کب اپنے نقشِ قدم ڈھونڈنے سفر کر رہی تھی۔ میرے ذہن میں سالوں پہلے بلکہ آدھی صدی سے بھی زیادہ گزرا ہوا زمانہ میرا ہم سفر تھا۔

کوئی یادیں تھیں ہی نہیں، سو انہیں تازہ کرنے کا سوال کب پیدا ہوتا تھا۔ مَیں تو ان کہانیوں کے آغاز میں گھوم رہی تھی جو میرے باپ دادا کی زندگیوں سے متعلق تھی۔ مَیں جاننا چاہتی تھی کہ جو لوگ شان سے زندہ رہے ہوں نام پیدا کر کے جیے ہوں۔ کچھ کام کر کے دنیا سے رخصت ہوئے ہوں۔ ان کے نام صدی گزر جانے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں کہ نہیں؟

مجھے اس کا جواب معلوم تھا۔ ہاں ان کا نام ایک صدی تو کیا صدیوں بھی زندہ رہتا ہے۔ جیسا کہ علی گڑھ کے روحانی باپ سر سیّد احمد خان کا۔ کیا کوئی صدی بھی انہیں بھلا سکتی ہے؟ نہیں نا۔ لیکن اپنے آباؤ اجداد کی کہانیاں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ یہ ضرور ہے کہ سر سیّد سے جُڑی ہوئی تھیں۔ وہاں کے اکابرین سے جڑی ہوئی تھیں۔ ان کے کاموں کے ساتھ، ان کے کارناموں کے ساتھ، ان کے نام کے ساتھ، ان کا نام نتھی تھا۔ کیا وہ لوگ بھی زندہ ہیں، صدی گزر جانے کے بعد بھی؟ مَیں یہ سوال لیے اس شہر کی طرف دوڑی چلی جا رہی تھی۔ اور اگر ایسا نہ بھی ہوگا، مَیں نے

سوچا، تب بھی مَیں ان کے نقشِ قدم ڈھونڈنے تو نکلی ہی ہوں ناں۔ مَیں ضرور ڈھونڈ نکالوں گی۔ ان کی سانسیں آج کی ہواؤں میں، آج کی فضاؤں میں موجود ہوں گی، مَیں ان سے کشید کرلوں گی۔ اس عمارت میں، اس کمرے میں کہیں نہ کہیں انہیں کھڑا ہوا، بیٹھا ہوا پاجاؤں گی۔ مجھے یقین تھا۔ اگرچہ میرا یہ سفر بہت دیر سے ہوا مگر پھر آج مَیں اس سفر پر روانہ تو ہو ہی چکی تھی۔

دہلی سے علی گڑھ تک کا راستہ اچھا بھی تھا اور ہچکولے لیتا بھی۔ شروع شروع میں پکی سڑک تھی جس پر گاڑی آرام سے چل رہی تھی۔ جوں جوں علی گڑھ آتا گیا راستہ خراب ہوتا گیا۔ مجھے دکھ محسوس ہوا۔ اس راستے پر تو روزانہ دہلی سے علی گڑھ اور علی گڑھ سے دہلی سفر کرنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ سڑک کی ٹوٹ پھوٹ کا خیال کسی کو پریشان کیوں نہیں کرتا؟ انتظامیہ اس سڑک کو بہتر کیوں نہیں بناتی؟

یہ سوال تو بارہا ہم نے اپنے ملک میں بھی بہت ساری شاہراہوں پر اٹھایا ہے۔ آج ایک دوسرے ملک میں بھی اپنے آپ سے دہرا رہے تھے۔ تقریباً دو گھنٹے کے اس سفر میں شاید ہی میری پلکیں معمول کے مطابق جھپکی ہوں گی۔ مَیں کوشش کر رہی تھی کہ سارے مناظر اپنی آنکھوں میں سمیٹ لوں۔ کچھ رہ نہ جائے، طویل سڑک، کچے مکانات، اونچے نیچے درخت، چھوٹی موٹی آبادیاں، کھیلتے کودتے بچے، مَیں سب دیکھ رہی تھی۔ بس دیکھے جا رہی تھی۔ اگرچہ یہ میرے لیے غیر اہم تھے لیکن یہ ان راستوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ سو انہیں نظر انداز کرنا میرے بس سے باہر تھا۔

جانے کتنی بار میرے ابا اور دادا نے ان راستوں پر سفر کیا ہوگا؟ بار بار یہ سوال میرے ذہن میں ابھر رہا تھا۔ جذبات کا طوفان تھا اور مَیں اس میں گھری ہوئی تھی۔ علی گڑھ کی نمائش کا میدان نظر آیا۔ سنی سنائی ساری کہانیاں بھی میرے ذہن میں امنڈ آئیں۔ پھر وہ چہار دیواری، وہ مقدس درسگاہ بھی آ گئی کہ جس کیمپس میں ہم رہا کرتے تھے۔ بچپن کے وہ دن جو مجھے یاد بھی نہیں تھے۔

شعبۂ اردو کے پروفیسر صغیر افراہیم صاحب کا فون قدم رکھتے ہی موصول ہوا۔ "ہم آپ کے منتظر ہیں۔"

مَیں تو جانے کب سے اس شعبے میں جانے کی منتظر تھی۔ وہ گاڑی لے کر آ گئے اور چند منٹ ہی میں ہم وہاں پہنچ گئے۔ مَیں چل نہیں رہی تھی، اُڑ رہی تھی۔ آج برسوں کی آرزو پوری ہو رہی

تھی۔ مَیں رشید احمد صدیقی کے شعبے میں تھی جہاں میرے ابّا نے ان کے ساتھ کتنے ہی خوش گوار لمحے گزارے تھے۔ مَیں ان لمحوں کی خوشبو سونگھ رہی تھی۔ جسمانی طور پر تو نہ میرے ابّا وہاں تھے نہ رشید صاحب لیکن دونوں کا تعلق پھر بھی موجود تھا۔ مجھے واقعی ان کی خوشبو محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے ایسے میں ڈاکٹر احسان رشید بھی یاد آئے جو میرے استاد تھے اور مَیں نے ان کی شاگردی کے بعد ایک دن کراچی یونی ورسٹی میں کھڑے کھڑے ان سے کہا تھا۔ ''آپ کے ابّا میرے ابّا کے استاد تھے اور آپ میرے استاد لیکن آج کے بعد استادی آپ کے خاندان سے میرے خاندان میں آجائے گی اور شاگردی آپ کے خاندان میں کہ مَیں نے بھی استادی کا منصب سنبھال لیا ہے۔'' میری اس گفتگو پر وہ مسکرائے تھے۔ اپنی طرح بہت ہی خوب صورت مسکراہٹ۔

سامنے رشید صاحب کی تصویر آویزاں تھی۔ میری آنکھیں عقیدت سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ شعبے کا یہ کمرہ وہی پرانا ہے یا اب جگہ بدل گئی ہے۔ لیکن مَیں چاہتی تھی کہ پرانا تعلق ٹوٹے ہی نہیں۔ مَیں یہ سوال کرنا نہیں چاہتی تھی۔

صدرِ شعبہ پروفیسر عقیل احمد صدیقی نے محبت سے مجھے دیکھا۔ ان کی محبت مجھے اچھی لگی کہ وہ اپنے پیشرو عظیم پروفیسر رشید احمد صدیقی کی نشست پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دیگر اساتذہ میں شعبے کے سابق صدر پروفیسر محمد زاہد، پروفیسر جمال حسین، پروفیسر طارق چھتاری، ڈاکٹر سیما صغیر، ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی، ریسرچ اسکالر محمد فرقان سنبھلی، محمد سلمان محمد شاہد، اکرم وارث، عبدالرحمٰن، محمد معروف، ضمیر اللہ، کیف فرشوری، محمد فرحان، نیہا اقبال اور فوزیہ بھی موجود تھیں۔ صغیر صاحب میرا تعارف بڑے مؤثر انداز سے کرا رہے تھے۔ بار بار اپنے ابّا کا نام یہاں سن کر مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ بس مَیں اسی لیے تو یہاں آئی تھی۔ پروفیسر قاضی افضال حسین نے تو حد ہی کر دی۔ مَیں نے آلِ احمد سُرور کا ذکر کیا تو وہ فوراً اٹھ کر کمرے سے باہر چلے گئے۔ مَیں سمجھی دیر سے بیٹھے تھے، چلے گئے ہوں گے۔ مگر لوٹ کر آئے اور ان کے ہاتھ میں آلِ احمد سرور کی سوانح عمری ''خواب باقی ہیں'' میری نام لکھ کر مجھے تھما دی، مَیں ان کا جس قدر شکریہ بھی ادا کروں کم ہی ہوگا۔

سوانح عمری لکھنے کا وقت عمر کے آخری حصے میں آتا ہے۔ تب اکثر دیکھا گیا ہے کہ یادیں دھوکہ دے جاتی ہیں اور کچھ واقعات اور تاریخیں غلط یاد رہ جاتی ہیں۔ سُرور صاحب کے ساتھ بھی

ایسا ہی ہوا ہے۔انہوں نے میرے ابا کے انتقال کے وقت کی عمر پچاس برس لکھی ہے جبکہ وہ صرف چالیس سال کی عمر میں وفات پا چکے تھے۔کاش وہ 10 سال واقعی اور زندہ رہ جاتے تب میری آنکھوں میں ان کا سراپا تو محفوظ ہو جاتا۔

صغیر افراہیم صاحب نے شعبہ دکھایا۔وہ تمام کتابیں دکھائیں جو شعبے میں چھپتی رہی ہیں۔ انہوں نے بہت ساری کتابیں دیں بھی۔سیمینار میں ایک نشست کا اہتمام بھی تھا۔انتہائی محبت کے ساتھ میرا ایک مضمون بھی سنا گیا جسے مَیں نے روتے روتے سنایا جو میرے اَن دیکھے ابا سے ہی متعلق تھا۔

مَیں آسمانوں پر اُڑ رہی تھی کہ میرا نصیب آج مجھے اس شعبے میں لے آیا ہے جہاں کے میرے ابا طالب علم تھے اور جہاں استاد بننے کی تمنا رکھتے تھے لیکن بقول رشید احمد صدیقی۔''یونی ورسٹی حکام کے اس مقولے کو رد کرنا بھی آسان نہیں تھا کہ اردو پروفیسر تو آج نہیں کل مل ہی جائے گا مگر اسٹیوارڈ کی پوسٹ کے لیے حسن عبداللہ جیسا ایمان دار میرِ سامان ملنا دشوار ہی نہیں محال بھی ہے۔''

سیمینار میں میری کتابوں کے ساتھ میری مرتّب کردہ ''افکارِ حسن'' جو میرے ابا کا شعری مجموعہ ہے، جسے 2007ء میں مرتّب کیا تھا اور آج تک یہاں نہیں پہنچ پائی تھی، رکھ دیا گیا۔گویا میری زندگی کا ایک بہت بڑا فریضہ انجام پا گیا۔مَیں نے ان کے لیے پوری زندگی میں بس یہی تو ایک کام کیا ہے اور آج مجھے اس کا صلہ مل گیا۔

مَیں نے صغیر افراہیم صاحب کا شاید الفاظ میں شکریہ نہ ادا کیا ہو مگر وہ بھی جانتے ہیں کہ مَیں دل سے ان کی مشکور ہوں۔اللہ تعالیٰ نے یہ کام ان کے ہی ہاتھوں سے کرانا تھا۔

اور اس وقت تو میرا دل ایسا سرشار تھا جب شعبۂ اردو کے سربراہ جانشینِ رشید احمد صدیقی میرے اور میرے ماضی کے بارے میں تقریر کر رہے تھے۔میرا تعلق کس کس طرح اس شعبے سے جوڑ رہے تھے جہاں سے مَیں نے ایک جماعت بھی پاس نہیں کی تھی۔پھر ہم صغیر افراہیم صاحب کے ساتھ رسالہ تہذیب الاخلاق کے دفتر گئے جس کی ادارت حال ہی میں انہوں نے سنبھالی ہے۔

یہ سب کچھ تو مَیں نے سوچا بھی نہیں تھا جو آسانی کے ساتھ ہوتا جا رہا تھا۔اس خوب صورت دفتر میں میری ملاقات بڑی قابلِ قدر ہستیوں سے ہوئی۔ان کی گفتگو میں علی گڑھ کی ساری

روایات گندھی ہوئی تھیں۔ مجھے سرسیّد کے تہذیب الاخلاق کا لائف ممبر بنالیا گیا۔ ڈھیر سارے پرچے تحفے میں دیے گئے۔ ''رفتار'' شعبے کا رسالہ، شعبے کا مجلّہ، جی چاہ رہا تھا، ساری کا پیاں اٹھالوں لیکن بار بار وزن کا خیال آ رہا تھا جو سفر کے لیے مقرر تھا۔ ہر ایک کا ایک ایک شمارہ لیا، دوسروں پر نظر جمائے رکھی۔

اساتذہ شکوہ کر رہے تھے کہ وقت کم ہے اور یہ بھی کہ یونی ورسٹی بند ہے۔ مجھے اس وقت نہیں آنا چاہیے تھا اور اتنا کم وقت نہیں دینا چاہیے تھا۔ یہ ان کی محبت تھی، لیکن قدرت نے تو میرے لیے اتنا ہی اور ابھی کا ہی وقت لکھا تھا جو مجھے مل گیا۔ کیا یہ شکرگزاری کے لیے کم تھا۔ مَیں تو زندگی بھر سے اسی لمحے کی منتظر تھی۔

صغیر افراہیم صاحب نے مہربانیوں اور خاطر نوازیوں کی حد کی ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ ہمیں ریاض الرحمٰن شیروانی صاحب کے گھر حبیب منزل لے گئے۔

کون نہیں جانتا کہ ان کے دادا حبیب الرحمٰن شیروانی علی گڑھ کی تاریخ میں کیا حیثیت اور مرتبہ رکھتے ہیں۔ یونی ورسٹی سے ان کی وابستگی اور کارکردگی کا کوئی حساب ہی نہیں اور میرے لیے ذاتی طور پر وہ اس لیے بھی اہم تھے کہ میرے دادا نے ان کے ساتھ سالہا سال کام کیا اور وہ میرے والد کے انتقال پر دہلی سے بطور خاص علی گڑھ آئے تھے۔

''حبیب منزل'' میں ریاض الرحمٰن شیروانی سے میری ملاقات پوتے اور پوتی کی ملاقات تھی۔ زمانہ دو نسل آگے بڑھ کر گلے مل رہا تھا۔ ریاض الرحمٰن صاحب نے تو اپنے دادا کی علمیت واہلیت کے بہت سارے خواص کو اپنی شخصیت میں سمولیا تھا اور اپنے آپ کو بھی منوالیا تھا لیکن ہاں مَیں اپنے آپ سے شرمندہ تھی۔

''تھے وہ آباء تو تمہارے ہی مگر تم کیا ہو؟''

ایک بار پھر مَیں اپنے آپ سے مخاطب تھی۔

شیروانی صاحب کی گفتگو کی شیرینی، لہجے کی نرمی اور شخصیت کے حُسن نے دیر تک مجھے مسحور کیے رکھا۔ انہوں نے چائے کے ساتھ بہت کچھ کھانے کے لیے بھی پلیٹ میں سجادیا تھا لیکن ان کی باتوں کے آگے کسی اور طرف دھیان دینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اپنی کتاب ''دھوپ

چھاؤں'' میرا نام لکھ کر جب انہوں نے میرے ہاتھوں میں پکڑائی تب مجھے خود اپنی قسمت پر ناز ہونے لگا۔

تاریخ تیزی سے ماضی سے دوڑتی ہوئی حال میں آموجود ہوئی تھی۔ہاں مجھے ان ہی لمحوں کا تو مدتوں سے انتظار تھا۔

حبیب منزل میں جانے کتنی بار میرے ابا اور دادا کے قدم آئے ہوں گے۔آج میں اسی حبیب منزل جیسے عظیم اور تاریخی گھر میں داخل ہوئی تھی۔

یہ پہلی ملاقات شاید پھر تجدیدِ ملاقات کا درجہ حاصل کر لے یا شاید سرحدی حد بندیوں کے باعث آخری بن جائے۔مگر جو ملاقات ہوگئی وہ زندگی کو بارآور کرگئی۔یہاں بھی مَیں صغیر افراہیم صاحب کی مقروض ٹھہری۔

اس کے بعد دوسرا دن آیا جو ظلّ الرحمٰن کے لیے وقف تھا۔ جو یقیناً پاکستان کے لطف اللہ صاحب سے ملتے جُلتے تھے۔لطف اللہ صاحب نے پاکستان میں آواز کی ایک دنیا بسائی ہوئی تھی جو شاید دنیا کے واحد انسان تھے جن کا یہ مشغلہ تھا۔ان کے بارے میں ایک خاکہ لکھ چکی ہوں اور بارہا ان سے ملاقات میں اپنی ذات کو اونچا محسوس کرتی رہی کہ ان جیسی شخصیت سے میری قربت اس حد تک تھی اور اب ہندوستان کے ظلّ الرحمٰن صاحب میرے سامنے تھے جنہوں نے عجائب اور ماضی کے بے شمار دنوں کو اپنے قبضے میں رکھا تھا۔کیا نہیں تھا ان کے پاس؟ چند لائنوں میں اس کا ذکر زیادتی ہوگی،اس پر ایک علیحدہ مضمون لکھنا ضروری ہے۔

حکیم ظل الرحمٰن صاحب کی ابنِ سینا اکیڈمی کیا تھی۔حیرت کا سمندر تھی۔ہندوستان کی ساری تہذیب اس میں موجود تھی۔ ہزاروں سال پرانی اشیاء، کتابیں، شخصیتیں، چیزیں، تصاویر خوب صورتی اور اہتمام کے ساتھ رکھی ہوئی تھیں جنہیں با قاعدہ توجہ سے دیکھنے کے لیے کئی دن چاہئیں تھے۔ چند گھنٹوں میں سرسری دیکھنے کی یہ اکیڈمی تھی ہی نہیں۔مَیں اس سے پہلے کراچی میں لطف اللہ خان صاحب کا آوازوں کا خزانہ دیکھ چکی ہوں۔ان دونوں شخصیات میں مجھے بہت مماثلت محسوس ہورہی تھی۔ظل الرحمٰن صاحب انسان ہیں شکلاً، کام کے اعتبار سے یقیناً جن ہیں۔74 برس کی عمر ہے اور ہزار ہا کارنامے ہیں۔چالیس کے قریب کتابیں لکھیں۔درجن بھر

سے زیادہ ایوارڈ حاصل کیے۔ طب میں مہارت حاصل کی۔ ادارے بنائے۔ لائبریری بنائی جس میں عربی، فارسی، اردو، سنسکرت اور انگریزی زبان کی کتابیں جمع کیں۔ رسالوں کی ادارت کی اور اتنے بہت سے کام کیے جو اتنی مختصری مدت میں ممکن نہیں۔

مَیں تو صرف اسی قدر کہہ سکتی ہوں کہ ہم جیسے لوگ زندگی کے شب وروز ضائع کرتے ہیں اور ظل الرحمٰن صاحب جیسے لوگ ایک ایک لمحے کو مٹھی میں کس کے پکڑے بیٹھے ہیں۔ اللہ انہیں اور عمر دے، صحت کے ساتھ کہ وہ آئندہ نسلوں کے لیے اور بھی بہت کچھ کرسکیں۔

علی گڑھ کی ان شخصیتوں سے ملنا میرا نصیب تھا۔ اس دن اور علی گڑھ قیام کا آخری دن، مولانا آزاد لائبریری میں جانا تھا جہاں ڈاکٹر امجد صاحب نے یوں استقبال کیا کہ طبیعت خوش ہوگئی۔ مَیں خوش اس لیے بھی ہوئی کہ میری کتابیں بشمول ''افکارِ حسن'' اور'' کلام اشرف کمالِ حسن'' اس عظیم لائبریری کی زینت بنیں۔ جہاں دنیا کے عظیم لکھنے والوں کی تحریریں محفوظ ہیں اور ہاں جہاں میرے پردادا مولوی عبدالصمد صاحب جو سرسیّد احمد خان کے رفیق بھی تھے، ان کے قلمی نسخے اور ان کی ذاتی لائبریری کی کتابیں شاہ فرید عالم کلیکشن کے نام سے شیلف کی زینت بنی ہوئی ہیں۔

ڈاکٹر امجد صاحب نے خاصا وقت بھی دیا۔ تصویریں بھی کھینچوائیں، چائے بھی پلائی اور ساری لائبریری بھی دکھائی۔

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا سیکشن بھی دیکھا جس کی جلدیں قرینے سے رکھی ہیں۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کا ہفتہ وار تعلیمی اخبار'' کانفرنس گزٹ'' بھی دیکھا جس کی جلد 47 میں ابا کے بارے میں رشید احمد صدیقی کا مضمون شائع ہوا جو بعد میں گنج ہائے گرانمایہ میں شامل ہوا۔

ڈاکٹر امجد کو مَیں نے بتایا کہ میرے دادا اور یونی ورسٹی کے ٹرسٹی صاحبان کے قلمی نسخے میرے پاس محفوظ ہیں جن پر تقریباً ڈیڑھ سو سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اب ان کے صفحات اور روشنائی دم توڑ رہے ہیں۔ انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اگر وہ نسخے لائبریری کو مل جائیں تو ہم انہیں جدید طریقوں سے محفوظ کرلیں گے۔ شاید یہ کام بھی مَیں زندگی میں کرپاؤں۔

صغیر افراہیم صاحب نے مجھے گھیرے رکھنے کا عزم کررکھا تھا۔ لائبریری سے نکال کر وہ مجھے

سرسیّد ہاؤس لے گئے۔ محسنِ اعظم علی گڑھ جہاں ان کی روح آج بھی یقیناً آتی ہوگی، طالب علموں کو دیکھتی ہوگی، ان میں علم حاصل کرنے کی امنگ پیدا کرتی ہوگی، جب ہی تو یہ دنیا صدیوں سے آباد ہے۔ ''یہ ابر ہمیشہ برسا ہے یہ ابر ہمیشہ برسے گا۔''

سرسیّد ہاؤس میں ہر طرف سرسیّد ہی تھے۔ ان سے متعلق تمام چیزیں، کتابیں، لباس، فرنیچر سے لے کر تحریریں۔ تمام حروف، تمام کارنامے، تمام امنگیں، کوششیں اور ہزار ہا کارکردگی۔ جو امر ہو گئیں اور جو انہیں امر بنا گئیں۔

مَیں نے اپنی پسند کی جگہوں کی تصویریں اتاریں۔ خاص طور سے ان کے دستخط کی۔ ان کے قلمی نسخوں کی، سجے سجائے شوکیس کی جہاں ان کی قیمتی تحریریں محفوظ ہیں۔

انچارج صاحب نے میرے پردادا مولوی عبدالصمد سے متعلق سرسیّد کے تعلق کی تحریر نکال کر دکھائی۔ کوئی بھی سوچ سکتا ہے کہ اتنی عظیم یونی ورسٹی کے خاص میوزیم میں اگر اس کے آباؤ اجداد آج بھی موجود ہوں تو ان کے بعد آنے والی نسل اپنے اندر کس قدر تازگی محسوس کرتی ہوگی۔

مَیں صبح سے شام تک کیمپس میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی رہی۔ سورج اپنی تمام تر حرارت ناپ ناپ کر 48 اور 49 ڈگری تک کی صورت میں پریشان کرنے کی کوشش میں تھا لیکن یقین جانیے میرے دل کے اندر کی حرارت سورج کی گرمی کو مات دینے پر تلی ہوئی تھی اور یہ حرارت میرے دل کو وہ سکون بخش رہی تھی کہ جس کا علم صرف مجھے ہی تھا۔ شاید کوئی بھی لمحہ ایسا نہیں آیا ہوگا کہ مَیں نے اپنے معبود کا شکر نہ ادا کیا ہو کہ اس نے میرے شجرۂ نسب میں کیسے کیسے نگینے جڑ رکھے ہیں۔

سرسیّد ہاؤس سے نکلتے ہوئے مَیں نے آپ ہی آپ پھر دہرایا۔

''تھے تو آباء وہ تمہارے، ہی مگر تم کیا ہو؟''

جس رات ہماری علی گڑھ سے روانگی تھی، اس رات کے آنے سے میں خوف زدہ تھی۔ چاہتی تھی دن لمبا ہو جائے۔ شام گزرے ہی نا، رات ٹھہر جائے، مگر وقت بھلا کب ٹھہرا ہے۔ ہر پل بس گزرنے کے لیے ہی ہے۔

ہم سامان باندھ رہے تھے اور میرے ذہن میں وہ تمام ادارے، شعبے اور قبرستان گردش کر رہا

تھا جہاں جہاں میں گئی اور جہاں جہاں سے مَیں نے زندگی کی حرارت مستعار لی۔ اسی سوچ میں ڈوبی تھی کہ صغیر افراہیم صاحب اپنے ساتھ مہر الٰہی ندیم کو لے کر آ گئے۔

صغیر صاحب کے ہاتھ میں دو اخباروں کے تراشے تھے۔ ایک "انقلاب" اور دوسرا "سہارا" جس میں میری تصویریں چھپی تھیں۔ جانے کب یہ کام بھی صغیر صاحب نے انجام دے دیا تھا۔ اس کے بعد مَیں ہندوستان کے جس شہر میں گئی، اخبار کی خبر ساتھ گئی۔

مہر الٰہی صاحب میرے دادا کی کچھ تحریریں اپنے ساتھ لائے تھے، یہ آپ کے پاس کہاں سے آئیں؟ مَیں نے حیران ہو کر پوچھا۔

آج کل مَیں ان پر کام کر رہا ہوں۔ ان کا جواب تھا۔

کیسا کام؟ میری حیرانی برقرار تھی۔

مَیں نواب مزمّل اللہ خان صاحب کی سوانح حیات مرتب کر رہا ہوں جو ان کے پوتے مجھ سے کرا رہے ہیں۔ یہ چند خطوط ہیں جو ابوالحسن صاحب یعنی آپ کے دادا نے انہیں لکھے ہیں۔ یہ بہت اہم دستاویز ہے۔ یونی ورسٹی کی تاریخ میں اس کی اہمیت ہے۔ انہوں نے جواب دیا۔

مگر مجھے تو ان کے خطوط اور تحریروں کے بارے میں علم ہی نہیں؟

نہیں ہو گا۔ یہ کاغذات مجھے مزمّل اللہ صاحب کی لائبریری سے ملے ہیں۔ مَیں تہذیب الاخلاق کے دفتر میں آپ کی گفتگو سن رہا تھا اور جان گیا تھا کہ مولوی ابوالحسن آپ کے دادا ہیں۔ سو مَیں یہ تحریریں آپ کو دکھانے کی غرض سے لے آیا ہوں۔

مَیں انتہائی تشکر سے ان کی جانب دیکھ رہی تھی۔ کیسے کیسے لوگ آج بھی اس سرزمین سے جڑے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ تو مجھے زندہ اور زندہ اور زندہ کرنے پر بلا معاوضہ مامور ہیں۔

مہر الٰہی ندیم میری زندگی میں ملنے والی شخصیتوں میں ایک اہم مقام حاصل کر چکے ہیں۔ مَیں ہمیشہ ان کے لیے دعا گو رہوں گی۔ مَیں سوچ ہی رہی تھی کہ انہوں نے اپنی پٹاری سے ایک پوسٹ کارڈ نکال کر میرے ہاتھوں پر رکھ دیا۔

یہ کیا ہے؟ کیا ابھی تک پوسٹ کارڈ یہاں چلتا ہے؟

آپ اسے پڑھیں تو سہی۔ انہوں نے دھیمے سے کہا۔

پہلی لائن پر نظر پڑتے ہی مَیں چیخ پڑی۔ وہ تحریر ایک تاریخ پر اور سن پر مشتمل تھی۔

یہ تو میرے ابا کے انتقال کی تاریخ ہے۔ مَیں چیخی۔

آگے پڑھیے۔ وہ اطمینان سے بولے۔

تحریر نواب مقتدا خان شیروانی کی تھی جنہوں نے نواب حبیب الرحمٰن شیروانی کے نام یہ پوسٹ کارڈ ارسال کیا تھا کہ حسنؔ عبداللہ اسٹیوارڈ مسلم یونی ورسٹی کا علی گڑھ میں انتقال ہو گیا ہے۔ بس یہ مضمون تحریر تھا۔ چھ دہائیوں سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ حسنؔ عبداللہ علی گڑھ کے قبرستان جسے وہاں کے شوخ طلباء نے ''منٹو۔ای'' کا نام دیا ہوا ہے، محوِ خواب ہیں اور یہ پوسٹ کارڈ اب بھی خبر کی صورت میں موجود ہے اور مہر الٰہی ندیم کے قبضے میں ہے۔

جب یہ خط تحریر کیا گیا تھا، مَیں دو سال کی تھی اور الف ب بھی نہیں پڑھ سکتی تھی۔ آج یہ پڑھے جانے کا منتظر تھا جسے مَیں نے بھیگی آنکھوں سے لمحے بھر میں پڑھ لیا۔

علی گڑھ میں تو ہر طرف یادوں کی بارات تھی۔ یہاں کا سفر جانے مجھے جینے کا کتنا حوصلہ دے گیا جہاں میرے ابا نے جان کی بازی ہار دی تھی۔

زیست کے واسطے مر جانے کا عزم تو میرے ابا نے اچانک کر لیا تھا۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ ہم بچے تو ابھی نہ زندگی کا مفہوم جانتے ہیں نہ موت کی حقیقت۔ انہیں کون یہ سب کچھ سمجھائے گا؟

ان کا ہی ایک شعر سنیے:

ہم زندگی کے واسطے مر جائیں گے حسنؔ
جب اور کوئی زیست کا ساماں نہ کر سکے

علی گڑھ کو الوداع کہتے ہوئے بار بار میرے لبوں پر یہ دعا تھی کہ اللہ تعالیٰ کیا ایک سفر اور میری زندگی میں یہاں کا ممکن ہے؟

□

آگرہ میں دو درسگاہیں اور تاج محل

مَیں تو اپنے ابا کا نقشِ پا ہی ڈھونڈنے نکلی تھی سو جہاں جہاں جا سکی، جاتی گئی۔علی گڑھ کے بعد آگرہ میری کھوج کا دوسرا شہر تھا۔تاریخ جو میری قسمت میں لکھی گئی تھی وہ 24 مئی 2014ء تھی۔

آگرہ جو کبھی اکبر آباد کے نام سے جانا جاتا تھا۔آگرہ جو کبھی ہندوستان کا صدر مقام تھا۔ آگرہ جہاں دنیا کے سات عجائب میں سے ایک عجوبہ تاج محل، صدیوں سے اپنے حُسن، اپنی تاریخ اور محبت کی علامت بنا ہوا ہے۔ جہاں دنیا بھر کے سیّاح تقریباً روز آتے ہیں، آتے رہیں گے۔ تاج محل کے حُسن سے مسحور ہو کر جاتے ہیں۔اس کی تاریخ جانتے ہیں اور اس جذبے کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جس سبب اس کی تعمیر ہوئی۔ کچھ تو یہ بھی سوچتے ہیں کہ معماروں نے اپنے ہاتھوں کی قربانی بھی دے دی تھی اور یوں قسم کھالی تھی کہ اب دوسرا تاج محل دنیا کے کسی گوشے میں کبھی نہیں بن پائے گا۔وہ آج تک اپنے اس وعدے پر قائم ہیں۔

سکندر لودھی نے آگرہ شہر بساتے ہوئے کبھی یہ نہیں سوچا ہوگا کہ دریائے جمنا کے ساتھ ساتھ بسی ہوئی بستی کبھی ساری دنیا میں اپنے حُسن کے سبب جانی پہچانی جائے گی۔پھر ممتاز محل ملکہ ارجمند بانو نے کب اپنی آخری آرام گاہ کا اتنا خوب صورت تصور کیا ہوگا؟ اس نے تو شاہ جہاں سے ایک یادگار بنانے کی فرمائش کی تھی۔مگر چودہ بچوں کے باپ نے اپنی محبوب بیوی کے تصور سے بھی حسین مقبرہ بنا کر دنیا سے داد وصول کر لی۔وہ تو دولت مند تھا۔سونے چاندی کی محرابیں اور گنبد بنا سکتا تھا۔قیمتی نگینے بھی سجا سکتا تھا لیکن ہر شخص اپنی محبت کو محل میں کب بدل سکتا ہے؟ ساحر نے اسی لیے شاید

حسرت سے کہا تھا۔

اِک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق

لیکن دوسرے ہی لمحے دوسرا شاعر یوں بھی تو سوچتا ہے۔

اِک شہنشاہ نے بنوا کے حسیں تاج محل
ساری دنیا کو محبت کی نشانی دی ہے

آگرہ کے سفر میں کون ہے جو تاج محل کو ذہن میں نہ رکھے۔ اس سے مَیں بھی انکار نہیں کر سکتی۔ اگر چہ میرا مقصدِ سفر قطعی طور پر دوسرا تھا۔ مجھے تو آگرہ شہر کی اُن دو درسگاہوں میں جانا تھا جن کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ آج بھی اس شہر میں موجود ہوں گی اور سالوں سے نہیں بلکہ صدیوں سے علم و دانش بانٹ رہی ہوں گی۔

چالیس سال ایک درسگاہ سے منسلک رہنے کے بعد مَیں یہ اندازہ تو لگا سکتی تھی۔ مَیں جانتی تھی، ہر شخص کی زندگی میں اس کی درسگاہ ایک قیمتی یاد ہوتی ہے جہاں اگر اس نے پڑھا ہے تو اپنی جوانی کے کئی سال وہاں گزارے ہیں۔ وہ جوانی جو طلبِ علم سے بھری ہوتی ہے۔ وہ جوانی جو زندگی کے ہر دور سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہے۔ اور اگر وہ کسی درسگاہ میں پڑھا رہا ہے تب بھی وہ دور اس کی زندگی کا سب سے بامعنی دور ہوتا ہے۔ جہاں اسے جینے کا مطلب معلوم ہوتا ہے۔ جہاں وہ دوسروں کو جینے کا سبق دے رہا ہوتا ہے۔ جہاں اس کے ہاتھ میں قلم ہوتا ہے، نیلا قلم جس سے وہ ہاں'' کا نشان بناتا ہے اور لال بھی جس سے وہ نہیں'' کا نشان بناتا ہے۔ گویا وہ روز ہاں اور نہیں بتاتا ہے۔ سمجھاتا ہے، کیا کرنا ہے، کیا نہیں کرنا ہے۔ کیا سوچنا ہے، کیا نہیں سوچنا ہے۔ زندگی کا کیا مقصد ہونا چاہیے اور کیا نہیں ہونا چاہیے، کیسے زندہ رہا جائے اور کیسے زندہ رہنے سے پرہیز کیا جائے۔ یہ ہاں، نہیں دراصل زندگی گزارنے کا قرینہ ہے۔

اسی لیے تو درسگاہ زندگی میں ایک معنی رکھتی ہے۔ بچپن سے لے کر موت تک کسی سے بھی پوچھیں وہ اپنے اس ہی دور کو سب سے بامعنی، سب سے خوب صورت دور قرار دے گا۔ مَیں نے بھی اپنی درس گاہوں سے محبت کی ہے اور جو کچھ سیکھا ہے، وہاں سے ہی سیکھا ہے اور ہمیشہ لال

نشان سے بچنے کی کوشش کی ہے۔

آگرہ شہر کی دو درس گاہیں میرے ابا کی زندگی میں بھی ضرور یادگار رہی ہوں گی۔ ایک وہ جس میں انہوں نے پڑھا اور دوسری وہ جس میں انہوں نے پڑھایا۔

ہم علی گڑھ سے علی الصبح ان ہی دو کالجوں کو ڈھونڈنے آگرہ کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ جب گاڑی چل رہی ہو اور آپ اس میں بیٹھے ہوں تو آپ کا ذہن خاموش نہیں رہتا۔ وہ چپکے چپکے آپ سے باتیں کرتا رہتا ہے۔

میرا ذہن بھی مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔ اونچے اونچے درخت، سرسراتی ہوائیں، پتلی چوڑی سڑکیں، ان کے مختلف موڑ، چوراہے، سب ہی آپ سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ گاڑی ایک دھچکے کے ساتھ ایک جگہ رکی تب مَیں نے دیکھا کہ وہ ایک چوک کا کنارہ تھا۔ جہاں تین چار ٹھیلے والے تھے۔ ہر ایک نے کھیرے کے ڈھیر سجائے ہوئے تھے۔ چھلے چھلائے کھیرے جنہیں چیر کر وہ نمک یا شاید چاٹ مصالا بھر کر خریداروں کو تھما دیتے۔ یہی کچھ مَیں نے دہلی میں بھی دیکھا، علی گڑھ میں بھی اور اب آگرہ میں بھی۔ شاید یہاں اس کی پیداوار زیادہ ہوتی ہے۔ مَیں نے خود ہی جواب دے کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ ڈرائیور گاڑی سے اتر کر سینٹ جانس کالج کا پتا پوچھ رہا تھا۔ بے نیاز لوگ گزرتے جا رہے تھے اور کسی کو اس نام کے کالج کا پتا نہیں تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی چلا دی۔ کچھ دور جا کر چند نوجوان پیدل آ رہے تھے۔ مَیں نے زور سے کہا، ان سے پوچھو، یہ جانتے ہوں گے۔ ایسا ہی ہوا۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے آگے اور آگے چلتے رہنے کا مشورہ دیا۔

مَیں سوچ رہی تھی، ہم اکثر جو پتا راہ گیروں سے دریافت کرتے ہیں اس میں کتنی غلطی کرتے ہیں۔ ہر راہ گیر ہر جگہ اپنے ذہن میں نہیں رکھتا۔ طالب علموں سے پوچھو، وہ کسی بھی درسگاہ کا پتا بتا دیں گے۔

آگے اور آگے چل کر ایک موڑ آیا۔ پھر اور آگے چل کر ایک سیدھی لمبی شاہ راہ آ گئی۔ بس اسی کی بائیں جانب سینٹ جانس کالج کی قدیم پختہ عمارت موجود تھی۔

گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ چہار دیواری سنسان تھی۔ امتحان ہو رہے تھے مگر ابھی وقت شروع نہیں ہوا تھا لہٰذا، امتحان دینے والے اِکاّ دُکاّ طالب علم بلڈنگ میں موجود تھے۔

گاڑی اندر چلی گئی۔ اترتے ہوئے میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ جانے کن راستوں سے میرے ابا کا گزر رہتا ہوگا؟

باوجود اس کے کہ ابھی بھی صبح تھی مگر سورج اپنی تمام تر حرارت بکھیرنے کے کام پر مامور ہو چکا تھا۔ ہم سیڑھیاں چڑھتے ہوئے لمبے پتلے برآمدے میں آ گئے جہاں نوٹس بورڈ پر رول نمبر اور کلاس روم نمبر لکھے ہوئے تھے۔ یہ کام کرتے کرتے چالیس سال بیت گئے تھے، دیکھ کر اچھا لگا۔ امتحان کا موسم ہر جگہ ایک سا ہوتا ہے۔ سامنے ہی ایک کمرہ تھا جس میں کچھ لوگ آ جا رہے تھے۔ شاید وہ ٹیچر ہی ہوں۔ مَیں اس کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ وہاں امتحانی کاپیوں کا ڈھیر تھا اور اساتذہ کے ڈیوٹی چارٹ پھیلائے ایک استاد کرسی پر بیٹھے تھے۔ تین چار کھڑے اپنے اپنے ڈیوٹی روم کا نمبر معلوم کر رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ کمرہ دوسروں کے لیے No go room میں شمار ہوتا ہے۔ سو مَیں نے آداب کے مطابق اندر جانے کے بجائے انہیں باہر آنے کا اشارہ کیا۔ ایک خاتون ٹیچر باہر آئیں۔ مَیں نے جھٹ اپنا تعارف کرایا۔ ''میں 1927 کے بعد ملنے آج آئی ہوں، پرنسپل صاحب سے۔''

کرسچین ٹیچر نے یقیناً سمجھا ہوگا کہ سورج کی گرمی مجھ پر اپنا اثر دکھا چکی ہے۔ مَیں نے ٹھہر ٹھہر کر پھر سے گفتگو شروع کی۔ بڑے تپاک سے انہوں نے مجھے کمرے کے اندر ہی بلا لیا اور کرسی پر بٹھاتے ہی کولڈ ڈرنک کا آرڈر دے دیا۔ یہ ایک پروفیسر دوسرے پروفیسر کا استقبال کر رہی تھی۔ مجھے بہت اچھا لگا۔ پرچہ شروع ہونے کا گھنٹہ بجا اور مَیں باہر آ گئی۔

کچھ ہی دیر بعد پرنسپل صاحب آ گئے اور مجھے ان کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

پرنسپل آفس میں داخل ہوتے وقت مَیں اپنے آپ کو اپنا ابا ہی سمجھ رہی تھی۔ جھجکتے ہوئے قدم بڑھا رہی تھی کہ یہ وہ کالج تھا جہاں وہ استاد نہیں، طالب علم تھے۔ پرنسپل کی نظریں مجھ پر جم گئیں۔ وہ یقیناً یہ جاننا چاہ رہے ہوں گے کہ مَیں کون ہوں اور یہاں کیا لینے آئی ہوں؟

مَیں پاکستان سے آئی ہوں۔ کیا مَیں آپ سے بات کر سکتی ہوں؟ انہوں نے اٹھ کر استقبال کیا۔

تشریف لائیے۔ ان کا اردو لہجہ بہت اچھا تھا اور جس طرح انہوں نے بغیر یہ جانے کہ مَیں کون ہوں، میرا استقبال صرف پاکستان کے نام پر کیا۔ یقیناً یہ خوشی کی بات تھی۔

مَیں نے بیٹھتے ہی اپنا تعارف کرایا۔ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ میرے والد نے 1927ء میں یہاں سے بی اے کیا تھا۔ایم اے علی گڑھ یونی ورسٹی سے اور پھر کچھ عرصے یہاں پڑھایا بھی۔ مَیں یہاں ان کی یادتازہ کرنے آئی ہوں۔پہلی بار ہندوستان آئی ہوں۔وہ خوش دلی سے میری باتیں سن رہے تھےاور تعجب کرنے لگے کہ آپ صرف اپنے والد کی یاد میں یہاں آئی ہیں؟

مَیں نہیں جانتی، وہ کس کلاس روم میں بیٹھتے تھےاور کس اسٹاف روم میں ساتھی اساتذہ کے ساتھ رہے ہوں گے کہ آج زمانہ گزر گیا۔وہ یادگاریں بھی ختم ہوگئی ہوں گی۔جیسے مَیں آپ ہی آپ بول رہی تھی۔''نہیں چند کلاس روم اب بھی ہیں، وہاں کے فرنیچر بھی تبدیل نہیں ہوئے مگر سب خستہ حالت میں ہیں۔''

وہ میرے اشتیاق کو دیکھتے ہوئے مجھے ساتھ لے کر کالج گھمانے اور دِکھانے لگے۔روم نمبر 18 اپنی کہانی خود سنا رہا تھا۔مَیں نے بینچ پر اپنا ہاتھ پھیرا۔ایک پر بیٹھ بھی گئی۔شاید وہ اس پر بیٹھے ہوں شاید دوسری پر۔مَیں نے ہر بینچ پر نظر دوڑائی۔بلیک بورڈ بھی اسی زمانے کا دیوار میں دھنسا ہوا تھا۔اس پر آج تک کتنے ہی استادوں نے اپنے اپنے ہاتھوں سے چاک کے نشان بنائے ہوں گے۔جانے اپنے مضمون کو کن کن لکیروں، تصویروں اور تحریروں سے سمجھایا ہوگا۔مَیں نے بینچ پر بیٹھے بیٹھے ڈیسک پر سر رکھ دیا۔میری آنکھ سے قطرے نکل کر ڈیسک میں جذب ہوگئے۔مَیں نے اپنی آمد کو گویا آنسوؤں کی روشنائی سے ڈیسک پر تحریر کر دیا۔

مَیں زیرِ لب کہہ رہی تھی۔''ابا مَیں نے یہاں آ کر آپ کو ایک طالبِ علم کے طور پر محسوس کر لیا ہے۔بس مَیں یہی کچھ کر سکتی تھی۔''

وسیع و عریض عمارت نئی بھی تھی پرانی بھی۔وقت گزرنے کے ساتھ عمارتوں پر یہ وقت تو آتا ہی ہے۔

ہم دوبارہ آفس میں آ بیٹھے۔پروفیسر ال ایگزینڈر لال پرنسپل سینٹ جونس کالج ہمارے سامنے تھے۔ایم ایس سی اور پی ایچ ڈی آپ نے آگرہ سے ہی کیا ہے۔اس کے بعد کی چند ڈگریاں جرمنی سے حاصل کیں۔

مَیں اپنے ابا کے طالب علمی کے دور کے 87 سال بعد اس کالج میں انہیں ڈھونڈنے بیٹھی

تھی۔ پرنسپل لال بڑے شوق سے مجھے مخاطب کر رہے تھے۔

یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ اُن یادوں کو جمع کرنے یہاں آئی ہیں جو آپ کی نہیں آپ کے والد کی ہیں۔ مَیں آپ کے جذبات کسی قدر سمجھ سکتا ہوں۔ کاش ہمارے پاس پرانا ریکارڈ موجود ہو۔ مَیں کوشش کروں گا کہ مَیں ان سالوں کا ریکارڈ نکال سکوں اور آپ کو کچھ اور معلومات فراہم کر سکوں۔ وہ بار بار کہہ رہے تھے، مجھے آپ سے مل کر بے حد خوشی ہو رہی ہے۔

میری خواہش ہے کہ ان کا کلام آپ کے کالج کی لائبریری میں رکھ دیا جائے تاکہ ان کی موجودگی یہاں ہمیشہ کے لیے یقینی ہو جائے۔ انہوں نے خوشی خوشی ''افکارِ حسن'' ہاتھ میں لے لی۔

مجھے بھی خوشی ہوگی کہ یہ کتاب کالج لائبریری کی زینت بن جائے۔ اگرچہ مَیں اردو اسکرپٹ سے ناواقف ہوں لیکن چند اساتذہ اور بیشتر طالب علم اردو پڑھ سکتے ہیں۔ ان کے لیے یہ کتاب یقیناً قیمتی ثابت ہوگی۔

سینٹ جانس کالج 1850ء میں قائم ہوا تھا اور اب یہ دوسری صدی میں داخل ہو چکا ہے۔ یہاں کے سیکڑوں طالب علموں میں ایک میرے ابا بھی تھے، یہ سوچ کر مَیں خوش تھی۔

پروفیسر لال نے مہمان نوازی کے ساتھ ساتھ تصویریں بھی کھینچوائیں اور مجھے ایک خط بھی لکھ کر دیا جس کی عبارت میرے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ مَیں نے انہیں بتایا، سینٹ جانس کالج میں مشاعرے کی بھی روایت تھی۔ اب اگرچہ اردو فارسی کا شعبہ یہاں سے ختم ہو چکا ہے لیکن کبھی بڑی آب وتاب کے ساتھ یہ شعبہ یہاں موجود تھا اور اپنی پروفیسری کے دوران 15 فروری 1941ء کو انجمن ترقیٔ اردو سینٹ جانس کالج کے سالانہ مشاعرے میں میرے والد نے بھی شرکت کی تھی۔ وہ غزل ''افکارِ حسن'' میں موجود ہے۔ جس کے چند اشعار میرے ذہن میں گردش کرنے لگے:

مضرابِ غم کو مطربِ دمساز دیکھنا
خاموش کیوں ہے دل کا مرے ساز دیکھنا
سرمایۂ حیات ہوئی شورشِ جنوں
دیوانگیٔ شوق کا آغاز دیکھنا

دل اک تڑپ میں کون و مکاں سے گزر گیا
بے بال و پر کی قوتِ پرواز دیکھنا

یہ معلومات انہیں بھی خوش کر رہی تھی۔ کہنے لگے، آئندہ کسی بڑی تقریب میں وہ مجھے بطورِ خاص مدعو کریں گے۔

''میرے لیے اس سے بڑا اعزاز اور کیا ہوسکتا ہے؟'' مَیں نے آنسو بھری آنکھوں اور اٹکتے لہجے میں جواب دیا اور انہیں خدا حافظ کہہ کے اس یادگار کالج کے کیمپس سے نکل آئی......شاید پرنسپل کے ساتھ ساتھ پوری عمارت بھی مجھے خدا حافظ کہہ رہی تھی۔

دوسرا کالج، آگرہ کالج تھا جس کا پتا مَیں نے پرنسپل صاحب سے ہی پوچھ لیا تھا۔ یہ وہ کالج تھا جہاں میرے ابا نے پڑھایا تھا۔ کالج میں داخل ہوتے ہی پھر مجھ پر جذبات کا دورہ پڑا۔ تھکے تھکے قدموں سے پرنسپل آفس میں داخل ہوئی۔

ایک استاد نے میرا استقبال کیا۔ تعارف کے بعد انہوں نے بتایا کہ پرنسپل صاحب کالج سے باہر کسی میٹنگ میں مصروف ہیں، جلد آجائیں گے۔ اس عرصے میں ہم آپ کو یہاں کے اساتذہ سے ملواتے ہیں اور کالج بھی دکھا دیتے ہیں۔

یہاں پر بھی امتحان ہو رہے تھے اور سینٹر میں اساتذہ اپنی ڈیوٹی دے رہے تھے۔ جو اساتذہ فارغ تھے، ان سے ملاقات ہوئی جس میں سارے کے سارے ہندو اساتذہ تھے سوائے ایک خاتون کے جو انگریزی کی استاد تھیں اور لکھنؤ سے تعلق رکھتی تھیں۔

نوجوان سی یہ استاد پورے تپاک سے ملیں۔ ان کا نام شاداں تھا، وہ خوش اس بات پر بھی تھیں کہ انہیں پاکستان کی کسی پروفیسر سے ملنے کا پہلا اتفاق تھا۔

شکوہ کرنے لگیں کہ آپ کا قیام بہت مختصر ہے ورنہ مَیں آپ کو اپنے گھر ضرور لے چلتی۔ مَیں نے وعدہ کیا کہ زندگی رہی تو ایک بار پھر آؤں گی۔

کالج کے کلاس روم، اسٹاف روم، لائبریری، لیبارٹری دیکھتے ہوئے میرے جذبات وہی تھے جو سینٹ جانس کالج میں تھے۔

کالج موجود تھا۔ ان کے زمانے کے لوگ اللہ کو پیارے ہو چکے تھے اور وہ تو بہت پہلے ہی دنیا

چھوڑ چکے تھے۔ مَیں نے تو انہیں چلتے پھرتے دیکھا ہی نہیں لیکن ان کی زندگی کے اوراق پلٹنے کی خواہش میں پوری زندگی بسر کر ڈالی تھی۔ بس زندگی کی شام مجھے یہاں تک لے آئی۔

یہاں پر بھی اب اردو فارسی نہیں پڑھائی جاتی۔ شعبہ ختم ہو چکا ہے، ایک استاد تھے بھی تو انہوں نے اپنا تبادلہ لکھنؤ کرالیا۔ یہ وہی آگرہ ہے جہاں کبھی غالبؔ رہا کرتے تھے۔ جہاں شان دار مشاعرے ہوا کرتے تھے اور جہاں کے کئی شاعروں میں میرے والد نے بھی اپنا کلام سنایا تھا۔

انجمنِ ترقیٔ اردو آگرہ نے 9 ستمبر 1926ء کو مشاعرہ منعقد کیا۔ یہ میرے ابّا کی طالب علمی کا دور تھا۔ سینٹ جانس کالج کی طرف سے انہوں نے اس مشاعرے میں شرکت کی اور غزل پڑھی جس کے چند شعر مجھے یاد آ گئے:

مبارک خانہ بربادی جنونِ فتنہ ساماں کو
ہمیں کیا ہے کہ ہم تو گھر بنالیں گے بیاباں کو
اسیرانِ محبت کو رہائی خوش نہیں آئی
مجھے ذوقِ اسیری پھر لیے جاتا ہے زنداں کو

19 دسمبر 1936ء کو نواں سالانہ آل انڈیا مشاعرہ آگرہ کالج ہی میں ہوا، یہاں بھی وہ اپنی غزل کے ساتھ شریک ہوئے۔

بلبلہ بحر میں جس وقت فنا ہوتا ہے
کچھ خبر ہے اسے کیا رتبہ عطا ہوتا ہے
اِک بڑا فرض رہِ عشق میں ہے پاسِ ادب
سر کے بل طے ہو یہ منزل تو ادا ہوتا ہے

23 مئی 1938ء کو بھی آگرہ کالج نے مشاعرہ منعقد کرایا۔ جہاں انہوں نے شرکت کی اور غزل پڑھی۔

وہ آتے ہیں بہرِ عیادت سنبھل جا
مرے قلبِ مضطرب ترا امتحاں ہے

نشاں دے رہا ہے مگر قلبِ مضطر
یہاں ڈھونڈیے اس کی منزل یہاں ہے

بزمِ اقبال کے تحت آگرہ میں مشاعرہ 21 ستمبر 1940ء کو ہوا۔

نظر سے دور سہی دل میں تم کو پاتا ہوں
شبِ درازِ جدائی بھی اب دراز نہیں

دی گریںڈ آل انڈیا مشاعرہ، سیماب لٹریری سوسائٹی آگرہ کے تحت 30 نومبر 1940ء کو ہوا۔

بارِ امانتِ عظیم تُو نے اٹھا لیا تھا کیوں
حوصلہ اب وہ کیا ہوا تاب و تواں کہاں گئی

وکٹوریہ ہائی اسکول آگرہ میں دسمبر 1940ء کے مشاعرے میں بھی وہ شریک ہوئے۔

میرے خدا یہ بے کسی کس سے کہوں میں حالِ دل
ہنس کے وہ شوخ یوں کہے تیرے خدا کو کیا ہوا

آگرہ ہی وہ شہر ہے جہاں سے وہ مرض الموت لے کر علی گڑھ پہنچے تھے۔ آگرہ کسی کام سے گئے تھے، ساتھیوں نے ان کے اعزاز میں تقریب رکھ دی۔ اس دن ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ کچھ نے کہا بھی، موقع تقریر کا نہیں، آرام کریں۔ طے پایا کہ اسٹیج پر جا کر صرف معذرت کر کے چلے آئیں گے۔ مگر جب کھڑے ہوئے تب ڈھائی گھنٹہ دھواں دھار تقریر کرتے گئے۔ طبیعت زیادہ خراب ہوئی، علی گڑھ لائے گئے مگر چند روز بعد ہی آخرت کی جانب سفر کر گئے۔ مَیں آگرہ کالج کے پرنسپل آفس میں بیٹھی پروفیسر رشید احمد صدیقی کے لکھے گئے خاکے کو دل ہی دل میں پڑھ رہی تھی۔

پرنسپل ڈاکٹر ایم کے راوت تشریف لے آئے تھے۔ انہوں نے دیر سے پہنچنے کی معذرت کی پھر انتہائی خوش دلی سے میرا استقبال کیا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ مَیں پاکستان کے کسی کالج کی پروفیسر ہوں۔ آگرہ آ کر کالج دیکھنے چلی آئی ہوں۔

مَیں نے انہیں اپنے مقصد سے آگاہ کیا۔ ''افکارِ حسن'' انہیں پیش کی اور اس کے صفحہ نمبر 296 پر چھپے ہوئے آگرہ کالج کے پرنسپل ایچ کرال کا وہ سرٹیفکیٹ دکھایا جسے انہوں نے 2 مئی 1941ء کو

لکھا تھا اور جس میں اپنے ایک استاد کے لیے تعریفی جملے تحریر کیے تھے۔ یہ استاد میرے ابا تھے جنہوں نے کچھ عرصے اس کالج میں پڑھایا تھا۔

پرنسپل راوت نے مہمان نوازی کے بعد ایک خوب صورت خط تحریر کر کے مجھے دیا۔ کئی تصاویر بنوائیں اور ''افکارِ حسنؔ'' وصول کرتے ہوئے اسے کالج لائبریری میں رکھنے پر خوشی کا اظہار بھی کیا۔ مجھ سے پھر آنے کا وعدہ بھی لیا اور خود بلانے کی خواہش بھی ظاہر کی۔ میرے لیے اس سے بڑی خوشی اس وقت اور کیا ہو سکتی تھی۔ 1821ء میں قائم ہونے والا یہ کالج اپنے 193 سال پورے کر چکا ہے۔ وہ دوسو سالہ تقریبات منانے کا اہتمام کر رہے ہیں۔ زندگی رہی تو میرا بلاوا وہاں سے آئے گا اور اس قابل رہی تو وہاں پہنچنا میرے لیے انتہائی خوشی کا باعث ہوگا۔

واپسی پر مَیں نے کالج کی عمارت پر الوداعی نظر ڈالی اور ابا کی زندگی کا آخری شعر دہرایا۔ شاید یہ شعر انہوں نے آگرہ میں ہی کہا ہو کہ آگرہ سے واپسی کے صرف پندرہ دن بعد ان کا انتقال ہو گیا تھا اور 30 اگست کا لکھا ہوا یہ شعر ان کی ڈائری کا آخری تحریر کردہ صفحہ ثابت ہوا۔

ہم زندگی کے واسطے مر جائیں گے حسنؔ
جب کوئی اور زیست کا ساماں نہ کر سکے

واپسی پر میرے قدم تو بوجھل تھے مگر مَیں نے اپنے قد کو بلند ہوتے ہوئے محسوس کیا کہ جیسے مَیں نے ان کے جوتے میں اپنا پاؤں ڈال دیا ہے۔ پھر دونوں کالجوں کی لائبریری میں ان کی کتاب رکھوا کر یہ جانا کہ مَیں نے انہیں صدیوں تک زندہ رہنے کا سامان فراہم کر دیا ہے۔ ظاہر ہے ایک بیٹی اپنے اَن دیکھے ابا کو اس سے زیادہ اور کیا دے سکتی تھی؟ آگرہ شہر میں آخری کام تاج محل کے سامنے کھڑے ہو کر شاہ جہاں کو خراجِ عقیدت پیش کرنا تھا۔ پورا آگرہ شہر تاریخی عمارتوں سے بھرا پڑا ہے۔ اس تاریخی شہر کے لیے صرف ایک دن ناکافی تھا۔ مگر مجھے پندرہ روز میں پانچ شہروں میں جانا تھا سو آگرہ کے لیے بس یہی چند گھنٹے تھے۔

تاج محل تصویروں میں ہمیشہ رہا۔ آج اپنی نظروں کے سامنے تھا۔ جمنا کا کنارا اور تاج محل دنیا کا خوب صورت ترین نظارہ ہے۔ میری قسمت کہ یہ کنارا اور تاج محل دونوں میری آنکھوں میں تصویر بن کر محفوظ ہو گئے اور ان گنت سیاحوں میں میرا نام بھی داخلِ رجسٹر ہوا۔

آگرہ سے واپسی پر مَیں سوچ رہی تھی کہ ایک ایسی ہی شام میرے ابّا آگرے سے رخصت ہوئے تھے۔ اپنی زندگی کی آخری تقریر کر کے اور پھر علی گڑھ کے قبرستان میں جا کر ہمیشہ کے لیے سو گئے۔ یہ سوچے بغیر کہ ان کے ننھے منے بچے زمانے کے سرد و گرم کیسے سہہ سکیں گے۔ مگر شاید یہ سوچنے کے لیے اکیلی اماں کافی تھیں۔

❑

علی گڑھ سے اعظم گڑھ تک ریل کا سفر

آگرہ سے واپسی رات گئے ہوئی۔ مَیں یونی ورسٹی کیمپس کے ہوسٹل نمبر ایک کے روم نمبر سات سے اپنا بکھرا سامان سمیٹ رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ ذہن میں وہ تمام یادیں بھی سمٹتی جا رہی تھیں جو ان دنوں میں ایک ایک کر کے ذہن پر لکھی گئی تھیں اور جو بقیہ زندگی کی وہ یادیں بن گئی تھیں کہ جن کے سہارے مجھے آنے والے دن گزارنے تھے۔ مَیں جب اس شہر میں داخل ہوئی تھی تب جذبات کا طوفان تھا اور ذہن میں کوئی بھی یاد نہیں تھی کہ دو سال کے بچے کے ذہن کے کسی گوشے میں اس کا بچپن دھندلی لکیروں میں تو شاید موجود ہوتا ہوگا مگر کئی دہائیوں کے گزر جانے کے بعد وہ تحریریں کسی زمانۂ قدیم کی تحریر میں بدل جاتی ہیں، جنہیں پڑھنے کے لیے کسی ماہر کی ضرورت پڑتی ہے۔ مگر آج تک ایسا ماہر دنیا کو نہیں مل پایا ہے کہ وہ ان تحریروں کو پڑھ سکے۔ زمانۂ قدیم کے سکّے کھدائی کے دوران ملتے ہیں تو آثارِ قدیمہ کے ماہر پوری تگ ودو کے بعد فرمان جاری کر دیتے ہیں کہ یہ کس دور کے سکّے ہیں۔ ایک پرانی انسانی کھوپڑی پر ریسرچ ہو جاتی ہے۔ انسانی ڈھانچہ ملتا ہے تب بھی وہ کئی سو بلکہ کئی ہزار سال پرانا قرار دے دیا جاتا ہے۔ شہر موئن جو داڑو دنیا کی سب سے قدیم بستی کے طور پر پہچان لیا جاتا ہے۔ ہڑپہ کی کھدائی پر بھی ماہرین کتابوں پر کتابیں تحریر کرتے نہیں تھکتے۔ مگر کسی ماہر نے آج تک انسانی ڈھانچے پر ریسرچ کرتے ہوئے یہ نہیں بتایا کہ اس کا نام کیا تھا؟ اس نے کیسی زندگی گزاری، اس کا دل کیسے کیسے دھڑکا، اس کے ذہن میں خوشی اور غم کی کتنی ہی کہانیاں رقم ہیں؟ اس نے زندگی گزارتے ہوئے کتنی ہی سوچوں کو اپنے اندر رکھ کر

جینے کی راہ پیدا کی۔ کس نے کتنی محبت کی، اس کے ماں باپ، بہن بھائی کون تھے؟ اور وہ کتنے دن ان کے ساتھ رہ پایا تھا۔ وہ کن کن محرومیوں کا شکار رہا، اس کی کیا کیا فتوحات تھیں؟ جب اس کے اپنے اس سے بچھڑے تھے تب وہ کتنا رویا ہوگا۔ انسان کے پاس تو آج کچھ علم ہے اور کچھ علم حاصل کرنے سے وہ ہمیشہ بے بس پایا گیا ہے۔ اقبال نے کہا تھا۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

افکار کی دنیا ہوتی بھی تو بڑی ظالم ہے۔ زندگی سے دیمک کی طرح چمٹ کر رہتی ہے مگر اس کے کیڑوں سے کبھی نجات نہیں پا سکتی۔

مَیں نے علی گڑھ کے ڈھائی تین دنوں کے قیام میں اپنی زندگی کے ان دو سالوں کو یاد کرنے کی بہت کوشش کی جب مَیں ڈیڑھ ٹانگوں سے زمین پر چلا کرتی تھی۔ دونوں پاؤں زمین پر اعتماد کے ساتھ نہیں پڑ سکتے تھے۔ بس ایک ہاتھ میرے ہاتھ میں آجاتا تھا جو پکڑ کر مجھے چلنا سکھا رہا ہوتا۔ وہ ہاتھ میرے ابا کا ہوتا۔ مَیں تھک جاتی تب ان کی گود کی گرمی میرے وجود میں زندگی دوڑا دیتی۔ مَیں نے ان ڈھائی تین دنوں میں اس گرمی کی حدّت کو محسوس کرنے کی بڑی کوشش کی۔ کھلی بند آنکھوں میں اس کی شبیہ کو واپس لانے کی بھی کوشش کی مگر بے سود۔ مَیں یہ سب کچھ نہیں کر سکی کہ میری عمر صرف دو برس اور قد صرف چند فٹ ہی رہا ہوگا۔ ذہن اور دل اتنے سے قد اور اتنے سالوں میں شاید ہوتا ہی نہیں۔ مگر مَیں تو انہیں کھوجتی ہی رہی۔ اسی ادھیڑ بُن میں مجھے وہ شہر چھوڑنا پڑا جسے دیکھنے اور محسوس کرنے کی خواہش میں مَیں نے چھ سے زائد دہائیاں صرف کر دی تھیں۔

اس شہر کے سارے مناظر مَیں نے آنکھوں میں بند کر لیے تھے۔ یہاں کی شدید گرمی میرے جذبے کی گرمی سے تو مات کھا ہی چکی تھی۔ مَیں نے درختوں کی سرسراہٹ تک کو اپنے دل میں جگہ دے دی تھی۔ کیمپس کی عمارتیں، خالی خالی سڑکیں، اسکوٹر چلاتی ہوئی لڑکیاں، کتابیں تھامے بھاگتے دوڑتے طالب علم، چھوٹی چھوٹی گاڑیاں جن کے شیشے میں جھانک کر مجھے فائلیں اور کتابوں کے ڈھیر نظر آ جاتے۔ کیمپس کی خاموشی جو گرمیوں کی چھٹیوں کے سبب تھی، مجھے وہ مناظر بھی دکھا رہی تھی جب چھٹیاں ختم ہو جاتی ہیں اور طالب علموں کی گھنٹی بجنے کی پکار پر دوڑ

دھوپ میں اضافہ ہوجاتا ہے۔مَیں اس یونی ورسٹی کو دیکھنے کا خواب مدتوں سے دیکھ رہی تھی۔ سامان سمیت چکی تھی۔ کتابوں کا بیگ تقریباً خالی ہو چکا تھا جسے یہاں تک پہنچانے کے لیے مَیں نے ایئر لائن کے مقررہ وزن سے زیادہ بھاری کر لیا تھا۔مَیں اب بھی اس بے یقینی کی صورت سے دوچار تھی کہ یونی ورسٹی کی لائبریری میں میری اور میرے ابا کی کتابیں رکھی جا چکی ہیں؟مَیں کیسے یقین کر لیتی کہ رشید احمد صدیقی کے شعبے میں ان کے سب سے چہیتے طالب علم کا کلام رکھا جا چکا ہے جسے مرتّب کرنا میری زندگی کا واحد کارنامہ ہے اور جس کے لیے مَیں اپنے ابا کی زندگی بھر سے مقروض تھی۔قرض اتارنے کے بعد دل میں کتنا سکون سا جاتا ہے یہ تو بس وہی جان پاتا ہے جو قرض اتار پایا ہو۔

یونی ورسٹی کا قبرستان جس نے میرے ابا کے دوگز برابر گھر کی رکھوالی کی ہوئی ہے،مَیں اس کی بے حد مشکور تھی۔شکستہ سی قبر بے شک مجھے شکوہ کرتی محسوس ہوئی کہ جس نے پانچ بچے دنیا میں چھوڑے ہوں،کوئی ایک بھی کیوں نہیں کبھی اسے دیکھنے اور فاتحہ پڑھنے آیا۔شاید قبر اور قبرستان یہ جانتا ہو یا نہ جانتا ہو کہ ہندوستان تقسیم ہو چکا ہے۔آدھا اُجڑا تب پورا پاکستان بنا۔لوگ اِدھر سے اُدھر ہو گئے اور سفر کے لیے ایک کڑی شرط رکھ دی گئی۔پاس پورٹ اور ویزا۔یہی نہیں بلکہ دونوں سرحدوں پر پھیلی بے چینی،جو وقت بے وقت بڑھ جاتی ہے اور آنے جانے والے تڑپ کر رہ جاتے ہیں۔مَیں نے یہ محسوس کیا کہ قبرستان مجھ سے شکوہ کر رہا ہے۔تب مَیں اس کے کالے گیٹ سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی اور اپنی زندگی بھر کی بات اس کے گوش گزار کر دی۔مجھے ایک دم سے اچھا محسوس ہوا جیسے وہ کہہ رہا ہو،مَیں نے تمہارے دل کی بے چینی سے تمہاری معذرت قبول کر لی ہے۔کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خواہش بھی شدید ہو،وسائل بھی موجود ہوں پھر بھی بات بگڑ جاتی ہے اور ہاتھ کچھ بھی نہیں آتا۔مَیں نے پھر اس سے سرگوشی کی۔"یقین جانو،مَیں نے بارہا اس اَن دیکھی زمین کو خواب میں دیکھا ہے۔مَیں نے اپنے ابا کی قبر کی لوح کو بار بار پڑھا ہے۔سرہانے کھڑے ہو کر فاتحہ بھی پڑھتی رہی ہوں۔ایسے خواب تو میری زندگی میں بے شمار بار آئے۔بس معاف کر دو کہ قدم آج اٹھے ہیں،سوتے میں نہیں جاگتے میں۔"

تین دنوں میں سات بار کے پھیرے ختم ہوئے اور اب میری زندگی غازی پور تھی۔یہ وہ شہر تھا

جہاں مَیں نے اُسے دنیا میں آنے کے لیے چُنا تھا۔

مَیں نے بارہا گلوب کو اپنی انگلی سے گھمایا تھا۔ گویا دنیا کو چکر میں ڈال کر مَیں دنیا کو دیکھنے کی عادی تھی۔ مَیں بہت چھوٹی تھی جب سے مجھے سارے کھلونوں میں سے گول سا گلوب پسند تھا۔ جغرافیے کی ہر کتاب نقشے سے شروع ہوتی ہے اور نقشے پر ختم ہوتی ہے۔ پہاڑ کے رنگ بھورے اور سمندر کے نیلے ہوتے ہیں۔ لکیریں دریا بناتی ہیں۔ نقطے، دائرے ملک اور شہر کی پہچان بتاتے ہیں۔ ہمیں ہر امتحان میں اپنے ملک اور دوسروں کے ملکوں کے نقشے بھی بنانے ہوتے تھے۔ اُس شہر کی نشاندہی کرنی ہوتی تھی جسے ممتحن ہماری مدد سے جاننا چاہتا تھا۔ ہم اکثر بے خیالی میں کسی بھی ملک کے نقشے پر ایک گول دائرہ بنا کر اس پر غازی پور لکھ دیا کرتے۔ مگر یہ احتیاط کرتے کہ ممتحن کے ہاتھوں میں پہنچنے سے پہلے پہلے مٹا کر صحیح نام لکھ دیں۔ مگر پہلا نام غازی پور ہی ہوتا۔ مَیں شاید یہ اپنے آپ کو بتانا چاہتی تھی کہ دنیا خواہ کتنی ہی بڑی ہو۔ لمبی چوڑی ہو، زمین ہو یا پانی ہو۔ میرے ذہن کی دنیا میں بس وہ غازی پور ہی ہے۔

ہر نقطہ بس یہی ہے جسے چاہیں سمیٹ لیں چاہے پھیلاتے جائیں۔ میرے ذہن کے دائرے میں ہر دائرہ بس میرا شہر ہے۔

یہ وہ شہر ہے جو بالکل سندھ کے راجہ داہر کے قصّے سے مناسبت رکھتا ہے۔ اس شہر کی ایک بڑھیا نے اپنی ننھی سی بیٹی کو ایک ظالم راجہ سے بچانے کے لیے بادشاہِ وقت سے درخواست کی تھی۔ اُس زمانے کے بادشاہوں کے پاس غریب اور مظلوم لوگوں کی داد اور فریاد سننے کا بڑا وقت ہوتا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ انتخابات کے دوران ان کی انتخابی تقریریوں شروع ہوتی ہو کہ وہ کامیاب ہو کر انصاف گھر کی دہلیز تک پہنچائیں گے اور منتخب ہو کر وزیرِاعلیٰ کے بجائے خادمِ اعلیٰ کہلانا پسند کریں گے۔ اور پھر منتخب ہونے کے بعد انصاف لکھنے کے لیے قلم روک کر سوچیں گے کہ انصاف ''ص'' سے لکھا جاتا ہے یا ''س'' سے اور یہ دہلیز کیا چیز ہے؟ پھر یہ بھی کہ خادمِ اعلیٰ سے زیادہ منافع بخش لقب تو غاصبِ اعلیٰ ہے کہ غصب کے نتیجے میں محلوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے؟

اس بڑھیا کی فریاد خادمِ اعلیٰ نے نہیں اس زمانے کے بادشاہ نے سنی تھی جس کا نام تھا فیروز

شاہ تغلق۔ یہ بادشاہ رہتا تو محل ہی میں تھا مگر محل سے باہر اس نے ایک زنجیر لٹکا دی تھی۔ جب فریادی وہ زنجیر ہلاتا، بادشاہ رات کی نیند بھی قربان کر دیتا۔ باہر آ جاتا۔ فریاد سننے اور انصاف فراہم کرنے کے لیے۔ دہلی کے اس حکمران نے امیر مسعود نامی ایک نوجوان کو ایک لشکر کے ساتھ راجہ ماندھاتا چکونی کی ظالمانہ حکومت کی سرکوبی کے لیے روانہ کر دیا۔

محمد بن قاسم کی طرح امیر مسعود ہندوستان کے اس ایک خطے جو شمالی ہندوستان کا مردم خیز علاقہ تھا، پہنچا۔ اس نے انتہائی نامساعد حالات کے باوجود فتح حاصل کی اور بڑھیا کو انصاف دلا دیا۔ بادشاہ فیروز شاہ نے خوش ہو کر امیر مسعود کو ملک السادات غازی کا خطاب عطا کیا۔

امیر مسعود نے 730ھ مطابق 1330ء میں ایک نئے شہر کی بنیاد رکھی اور بادشاہ کے دیے ہوئے خطاب ''غازی'' کے نام پر اس شہر کا نام غازی پور رکھا۔ امیر مسعود کا شمار ہندوستان کے چند قابل ترین حکمرانوں میں کیا جاتا ہے۔ اس نے اس شہر میں تقریباً 33 سال بسر کیے اور ان تمام سالوں میں اپنے بسائے ہوئے شہر کی اقتصادی، علمی، ثقافتی، دینی اور سیاسی سرگرمیوں میں وہ بہتری پیدا کی کہ اس شہر کا شمار بے حد متمدن شہروں میں ہونے لگا۔

وہ ایک انصاف پسند حکمران ثابت ہوا۔ بڑھیا کی بیٹی بڑھیا کو دلا کر اس نے انصاف کا بول بالا کیا۔ اس شہر کی بنیاد ہی انصاف پر رکھی گئی۔

اسی انصاف نگر میں کئی سو سال بعد ایک گھر جو بیدناتھ کے چوراہے پر تعمیر ہوا اور جس نے حسن منزل کا نام پایا، جس کے ایک لمبے اور چھ دروازے والے کمرے کے ایک کونے میں رکھی گئی ایک پلنگ پر میں نے اپنی زندگی کی پہلی سانس لی۔ پہلی چیخ بلند کی اور دنیا میں آنے کی پہلی اطلاع اپنے لوگوں کو دی۔ پہلی بار اپنے ابا کی گود میں آئی۔ اپنے کان میں دادا کی دی گئی پہلی اذان سنی۔ پہلی بار سینے سے لگائی گئی۔ پہلی بار اپنے گال پر کسی کے پیار بھرے لبوں کا لمس محسوس کیا۔ پہلی بار کی ہر تکرار اسی حَسن منزل میں ہوئی جس کی مَیں وارث بھی ٹھہری۔ مگر وراثت ہر ہجرت پر بدل جاتی ہے۔ پہلی ہی ہجرت نے مجھ سے یہ وراثت چھین لی۔ اب چھ دَہائیاں پوری کرنے اور صدی بدل جانے کے بعد مَیں اس جانب سفر کرنے پہلی بار نکل رہی تھی۔ میرا راستہ دہلی سے علی گڑھ پھر آگرے سے ہوتا ہوا ایک ٹرین کے ذریعے اس شہر تک پہنچا تھا۔

یہ ٹرین ہندوستان کی مسلمان اداکارہ شبانہ اعظمی نے اپنے والد کیفی اعظمی کے نام سے منسوب کرادی ہے۔ مجھے اچھا لگا، ایک بیٹی کا اپنے باپ سے پیار کہ مَیں بھی اپنے گم شدہ باپ کو ہی ڈھونڈنے نکلی تھی۔

اس کیفی ٹرین میں سامان رکھ کر جب مَیں کھڑکی کے پاس والی سیٹ پر بیٹھی تب میرے ذہن نے دوڑنا بھاگنا شروع کردیا۔ ٹرین کا یہ سفر تقریباً چالیس سال بعد ہورہا تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں ہم نے ٹرین کے کئی بار خواب ناک سفر کیے تھے۔ وہ زمانہ کتنا اچھا تھا کہ اپنے علاوہ دوسروں پر بھی اعتماد ہوا کرتا تھا۔ مَیں اکیلی پنجاب اور سرحد کے سفر کے لیے کراچی سے روانہ ہوجایا کرتی۔ اماں ناشتہ دان میں دودن کا کھانا رکھ دیتیں۔ انہیں سفر کے دوران میری بھوک کا تو خیال ہوتا لیکن یہ فکر ہرگز نہیں ہوتی کہ اکیلے سفر میں کچھ خطرات بھی ہوسکتے ہیں۔ ہاں ہماری طالب علمی کے زمانے میں ایسے خطرات تھے ہی نہیں۔ سفر کے بزرگ ساتھی فوراً ہمیں بیٹی بنالیتے اور ہم ان کی پناہ میں اپنی منزل طے کرلیتے۔

ٹرین میں بیٹھنے سے پہلے ہم ریلوے اسٹیشن کے بک اسٹال جانا نہیں بھولتے۔ ٹائم ٹیبل ضرور خریدتے۔ گھر سے بھی کئی رسالے اور کتابیں ساتھ رکھتے۔ کچھ نہ کچھ پڑھے بغیر ریل کا سفر خوش گوار ہوہی نہیں سکتا تھا۔ کھڑکی سے لگی سیٹ ہماری من پسند ہوتی ہے۔ ڈبہ خواہ تھرڈ کلاس والا ہی کیوں نہ ہو۔ رات کے سفر کا رومانس ہی کچھ اور ہوتا۔ ہر اسٹیشن پر کھڑکی سے جھانک کر اسٹیشن کا نام جاننا ضروری ہوتا اور ٹائم ٹیبل پر اس شہر کو ڈھونڈ کر نشان لگاتے اور وقت نوٹ کرتے کہ دیے گئے ٹائم سے ٹرین دیر سے پہنچی یا چند منٹ پہلے ہی۔ اُن دنوں ٹرین کئی کئی گھنٹوں یا کئی کئی دنوں لیٹ نہیں ہوا کرتی تھی۔ ہر اسٹیشن کی ساخت ایک جیسی ہوتی اور گونجتی آواز بھی ایک جیسی ہی ہوتی۔ گرمی میں ٹھنڈے شربت اور سردی کی راتوں میں گرم گرم ابلے انڈوں کی آواز آتی۔ روٹی اور پکوڑوں کو ملا کر کھانے کی فرمائش ہر بیچنے والے کی ایک جیسی دُھن میں سنائی دیتی۔ سنسان علاقوں اور گھنے جنگل سے گزرتے ہوئے انجن کی مخصوص آواز اور سیٹی ہزار ہا موسیقی سے زیادہ دل خوش کن محسوس ہوتی۔ مجھے تو ہر سفر میں جوش ملیح آبادی کی نظم ''ریل کا سفر'' ضرور یاد آتی اور جوش کو خراجِ تحسین پیش کرنا بھی ضروری خیال کرتی۔

پھر ہوا یوں کہ ہم بڑے ہو گئے ۔ کتابوں میں انکی اِکنّی اب پرس میں رکھے نوٹ اور ڈھیر سارے سکّوں میں بدل گئی ۔ یوں ہم نے ہوائی جہاز کا سفر شروع کر دیا جہاں روانگی سے قبل ایئر ہوسٹس کی آواز آتی جو ہمیں خوش آمدید کہتی اور سیٹ بیلٹ باندھنے کی ہدایت کے بعد بتا دیتی کہ ہماری پرواز کتنی اونچی ہوگی اور سفر کے اختتام پر پھر ایک رس بھری آواز آتی، ''سیٹ بیلٹ باندھ لیجئے آپ کی منزل قریب ہے'' اور موسم کا حال کچھ یوں ہے۔اس کی آواز میں معلومات کے علاوہ اور ایسی کوئی خوب صورتی پوشیدہ نہیں جیسی کہ ریل کے سفر کا ہر لمحہ دل میں طوفان برپا کیے رہتا ہے۔ مجھ سے پوچھیے تو مَیں تو یہی کہوں گی کہ ریل کا سفر دنیا کی ہر ترقی یافتہ سواری سے زیادہ حسین ہے۔ مگر شاید اب ایسا نہ ہو۔ زندگی میں اب گرمیوں کی چھٹیاں آتی ہی نہیں، ہر مہینہ چھٹی کا مہینہ ہے۔ چلیے یہ رومانس بھی زندگی سے رخصت ہوا۔

ریل کے سفر میں دن رات اور گھنٹہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ آپ کا پروگرام کچھ ہوتا ہے، ریل کا اپنا شیڈول ہے۔ آپ کو اتوار کے دن پہنچنا ہے، ریل آپ کو منگل کے دن پہنچائے گی کہ ریل اب ریلوے کے وزیر کے اختیار میں ہے خواہ شیخ رشید ہوں یا خواجہ سعد رفیق۔ ان کے دھواں دار بیانات ریل کی سیٹی جیسے سہانے ہرگز نہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ڈراؤنے ہیں۔ ایک دن کا سفر تین دنوں میں پورا کراتے ہیں۔ ایئر کنڈیشنڈ کا ٹکٹ دیتے ہیں اور پنکھے تک کو چلنے سے منع کر دیتے ہیں۔

بک اسٹال تو شاید اب بھی اسٹیشن پر ہوتے ہوں مگر ریلوے ٹائم ٹیبل ناپید ہو گئے ہیں بالکل ٹیلی فون ڈائرکٹری کی طرح۔ کیا خاک مزہ ہے اب ٹرین کے سفر میں اور فون نمبر تلاش کرنے میں۔ مَیں کیفی ٹرین میں بیٹھی پل بھر میں ماضی گھوم آئی۔ یہ ٹرین ہندوستان کی تھی۔ اسٹیشن علی گڑھ کا تھا۔ اس شہر کا اسٹیشن جہاں ابا کے دنیا سے چلے جانے کے بعد ہم اپنے ڈھیر سارے سامان کے ساتھ غازی پورا اپنے آبائی شہر روانہ ہوئے ہوں گے۔ مَیں نے آپ ہی آپ سوچا۔ اماں ایسی ہی کسی کھڑکی سے ٹیک لگا کر اسٹیشن پر اسٹیشن گزارتی، ہچکولے لیتے سوچ رہی ہوں گی کہ مَیں نے اپنے شریکِ سفر کو علی گڑھ کے ''منٹو۔E'' میں ہمیشہ کے لیے امانتاً رکھوا دیا ہے۔ اب مَیں زندگی کے سفر میں پانچ بچوں کی انگلیاں بیک وقت کیوں کر پکڑ سکوں گی؟ ٹرین خواہ چل ہی رہی ہو، میری زندگی

کا سفر تو رک گیا نا۔ اب اسٹیشن آئیں گے بھی تو کیا؟ تنہائی بھلا خوش گوار ہو بھی سکتی ہے؟

اماں نے تو جانے کیا کیا سوچا ہوگا۔ ان کے دکھوں کا شمار تو بے شمار تھا۔ ان کی نوے برس تک کی اکیلی زندگی میرے سامنے تھی۔ بلکہ میرے ساتھ ساتھ تھی۔ میرے ذہن میں موجود تھی جسے مَیں یاد بھی کر سکتی تھی اور جس کی گہرائی محسوس بھی کر سکتی تھی کہ اب مَیں دونوں پاؤں زمین پر جمائے کھڑی تھی اور میری عمر نہ دو برس تھی نہ میرا قد دو فٹ تھا۔ مَیں ان کی ہر سوچ اور ہر کرب سے آگاہ تھی۔ مَیں نے اس کرب کو ایک طرف رکھ دیا اور دوڑتی بھاگتی ٹرین میں اپنے آج کے ذہن کے سوئچ کو آن کر دیا۔

علی گڑھ کے قیام کے تین دنوں میں مَیں نے ہر اس مقام تک پہنچنے کی کوشش کی جس کا مجھے علم تھا۔ مَیں اس مکان کے دروازے پر بھی کھڑی ہوئی جو ہماری زمین پر تعمیر ہوا تھا۔ ''مشکوۃ'' نامی یہ گھر کی زمین ہماری ملکیت تھی مگر بورڈ پر کسی دوسرے کا نام تھا۔ مَیں نے اس گیٹ کے سامنے کھڑے کھڑے ڈھیر سارے آنسو بہائے۔ یہاں جب ابا اپنا گھر بناتے تو کون سا کمرہ میرا ہوتا۔ اندھیری رات کے اس ویران گھر میں مَیں وہ بے بنا کمرہ تلاش کر رہی تھی۔ بنا ہوا یہ گھر ویران ہی نہیں ہولناکی کا سماں پیش کر رہا تھا۔ عمارت اندر سے کیسی ہوگی، مجھے اس سے ذرا بھی غرض نہیں تھی۔ اونچے اونچے درخت، خودرو جھاڑیاں۔ بے آب پودے اور خشک زمین نوحہ پڑھ رہی تھی۔ قبضے کی زمین ایسی ہی ہولناک ہوتی ہے۔ میرے آنسو میرے دوپٹے میں جذب ہو رہے تھے۔ مَیں نہیں چاہتی تھی کہ اس زمین پر میرے آنسو گریں جو تھی تو میری لیکن جہاں رہنے والے احسان مند بھی نہ ہوں۔ اب تو وہ بھی اس دنیا میں نہیں ہیں اگرچہ وہ ہمارے عزیز تھے مگر مجھے بالکل عزیز نہ تھے۔

حامدہ آپا اور سعید بھائی کے طفیل ہم نے اپنی اس زمین کو دیکھ لیا جس کا علم تو ہمیں تھا مگر شہر کے حدود اربعہ میں وہ کہاں واقع تھی؟ ہم نہیں جانتے تھے۔ حامدہ آپا اور سعید بھائی بھی ہمارے عزیز ہیں۔ وہ ہمارے جذبات سے بھی واقف تھے۔ ہمارے آنسو اور ہمارے دل کی دھڑکن انہیں ہماری اندرونی کہانی سنا رہی تھی۔ میرا ہاتھ تھام کر وہ ہمیں ہمارے دوسرے ٹھکانے کی طرف لے گئے جس کا نام ''تعلیم منزل'' تھا۔ جس کا ذکر ہمارے ابا کی شاعری میں موجود تھا۔ اس نظم کے

حوالے سے مَیں نے تعلیم منزل دیکھی جہاں میرے بڑے بھائی کے لیے ابا نے ایک ابتدائی تقریب کا اہتمام بھی کیا تھا۔ جب میرے بھائی صرف آٹھ سال کے تھے۔ تاریخ 12 اکتوبر 1936ء تھی۔ مَیں کیا، میرے دوسرے تمام بہن بھائی بھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔ تب ابا نے منظوم دعا مانگی تھی۔

ہو عمرِ خضر و جاہِ سکندر اسے عطا

ثابت قدم ہو راہِ شریعت پہ دائما

میرے بھائی نے 85 سال عمر پائی۔ جاہِ سکندر بھی انہیں عطا ہوا، ثابت قدم بھی رہے، شریعت پسند بھی۔ اس مقام پر آنے سے صرف پانچ ماہ پہلے وہ دنیا سے جا چکے ہیں ورنہ واپسی پر مَیں انہیں بتاتی کہ مَیں نے وہ جگہ دیکھ لی جہاں آپ کو آپ کے ابا نے دعا دی تھی۔

ڈھیر سارے آنسو ایک ساتھ امنڈ پڑے۔ آنسوؤں نے تو برسنے کی ٹھان ہی لی تھی سو مَیں نے انہیں ان کے حال پر ہی چھوڑ دیا تھا۔ ٹشو پیپر آنسو جذب کرتے ہیں، سمندر تو نہیں۔ سو اب بس وہ اپنا راستہ خود نکال رہے تھے۔

چلتے چلتے ہم میرس روڈ تک پہنچ گئے۔ 2- میرس روڈ اب زمیں بوس ہو چکا ہے جہاں میرے ابا نے اپنی زندگی کی آخری ہچکی لی تھی۔ جہاں جامن کے درخت تھے جہاں کا صحن آم کے کئی پیڑ سمیٹے ہوئے تھا جہاں کگروندے لگے تھے۔ جہاں مہندی کی باڑھ تھی۔ جہاں صحن کے ایک کونے میں بڑا سا باورچی خانہ تھا۔ جہاں کئی کئی ملازمائیں دیگچیوں میں نہیں دیگ میں کھانا پکاتی تھیں کہ گھر مہمانوں سے بھرا رہتا تھا۔ جہاں ایک رات میری گڑیا چولہے میں گر گئی تھی اور جلتے کوئلے اور گرم گرم راکھ نے میری گڑیا کے سارے بال جلا دیے تھے جس سے وہ بہت بدصورت ہو گئی تھی اور جس کی جدائی پر مَیں بہت روئی تھی۔ اور اب مجھے اس بات پر غصہ تھا کہ میرے ذہن میں وہ ہولناک واقعہ کیوں موجود نہیں ہے جب میرے ابا چار پائی پر سفید چادر اوڑھے لیٹے تھے اور اپنے اسی گھر سے چار لوگوں کے کاندھے پر سوار جا رہے تھے۔ کیا مَیں اس دن روئی تھی؟ اسی طرح روئی تھی جیسے آج رو رہی ہوں یا اس سے بھی زیادہ؟

ٹرین نے پلیٹ فارم چھوڑ دیا۔ علی گڑھ پل بھر میں مجھ سے دور ہو گیا، ہوتا گیا۔ ٹرین پہلے سسک سسک کر چلتی ہے پھر تازہ دم ہو جاتی ہے اور فراٹے بھرتی آگے ہی بڑھتی جاتی ہے۔ ان

تمام مراحل سے گزر کر جب اس نے رفتار پکڑی تب مَیں شیشے سے پار دیکھنے لگی۔ اب مختلف اسٹیشن آتے اور جاتے رہیں گے۔

ہر اسٹیشن پر اسی قسم کی مخصوص آوازیں آئیں گی جیسے پاکستان کے اسٹیشن پر آتی ہیں کہ لوگ تو ایک جیسے ہی ہیں۔ پسند ناپسند بھی ایک جیسی، پہناوے بھی ایک جیسے، گفتگو کا لہجہ بھی یکساں۔ غالبؔ سب کے غالبؔ ہیں۔ اقبالؔ کا ترانہ دونوں کے لیے یکساں قبول۔ زمین پر بس ایک گہری لکیر کھینچ دی گئی ہے۔ یہ لکیر ہے تو جغرافیائی لیکن یہ کبھی نفرت کی لکیر بن جاتی ہے اور کبھی امن کی آشا کے ترانے گانے لگتی ہے۔

نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ مَیں ساری رات کے سفر میں پورا ہندوستان نہ سہی اس راستے پر آنے والے تمام شہر دیکھنا چاہتی تھی۔ لیکن ایئر کنڈیشنڈ کمپارٹمنٹ کے شیشے دُہرے تھے جن کے درمیان نہ جانے کب کا پانی رک گیا تھا جس کے باعث باہر کی دنیا دھندلی تھی۔ میری ماموں زاد بہن جس نے مجھے ہندوستان آنے کے تمام قانونی مواقع فراہم کیے تھے اور اعظم گڑھ سے دہلی تک مجھے لینے اپنے بیٹے کے ساتھ آئی تھی اور ہر جگہ میرے ساتھ تھی، جسے مَیں نے اپنی زندگی میں صرف ایک بار دیکھا تھا جب وہ خود پاکستان آئی تھی، اس نے یہ ضمانت لی تھی کہ مَیں ہندوستان قیام کے دوران کوئی ایسی حرکت نہیں کروں گی جو قابلِ گرفت ہوسکتی ہے اور اگر قابلِ گرفت حرکات کی فہرست میں رونا بھی لکھا ہوتا تب وہ قدم قدم پر پکڑی جاتی کہ مَیں تو لگتا تھا یہاں صرف رونے کے لیے ہی آئی تھی۔ اگر زیادہ سامان کے ساتھ زیادہ آنسوؤں کے ساتھ آنا منع ہوتا تب مَیں کئی صدیوں مَیں بھی یہاں نہ آپاتی کہ مَیں اپنے ساتھ یہ خزانہ وافر مقدار میں لے کر آئی تھی جسے پی آئی اے عملہ پکڑ سکا نہ ہندوستان کے کسی مقام پر کوئی بھی پولیس والا۔

میری بہن رات کے سفر کو سو جانے سے وابستہ رکھتی تھی، سو وہ تو سو گئی اور سونے سے پہلے مجھے بھی مشورہ دیتی گئی کہ ہم صبح اعظم گڑھ پہنچیں گے لہٰذا، اب جاگنے کی ضرورت نہیں۔ ریل کا سفر خواہ دن کا ہو یا رات کا، میرے لیے یوں بھی سونا حرام ہو جاتا ہے کہ مَیں جغرافیے کی کتابوں میں بنے نقشے اور ان پر پہاڑوں، دریاؤں، شہروں اور جزیروں کو دیکھ کر مفت میں دنیا کی سیر کرتی ہوں۔ مگر شہروں کے اسٹیشن دور تک بکھری ہریالی، کچے مکانات، کھیت اور اناج جمع کر لینے کے تکونے کچے

ستون، گھاس پھوس، چرتے جانور اور وہ بچے جو ریل کی پٹریوں پر دوڑتی بھاگتی ٹرین دیکھنے کھڑے ہوجاتے ہیں، وہ نہیں ملتے۔ انہیں تو بس ٹرین کے سفر میں ہی دیکھا جاسکتا ہے۔
مَیں ریل کے سہارے پل پل اس شہر سے قریب ہورہی تھی جس کے خمیر سے میرا وجود بنا تھا۔ اگر چہ منزل فی الحال اعظم گڑھ تھی جو میری بہن کا شہر تھا۔ جہاں کے ایک اسکول میں وہ پڑھاتی تھی اور جہاں سے چھٹی لے کر وہ میرے استقبال کے لیے خود دہلی آئی تھی۔ مَیں اس کی ممنون کیسے نہ ہوتی، خونی رشتے کئی دہائیوں کے بعد بھی کیوں نہ ملیں، اپنا خونی جوش مارنے سے نہیں چوکتے۔
رات کے بارہ گھنٹے اور صبح کے مزید چار چھ گھنٹے گزرنے کے بعد اعظم گڑھ آ گیا۔ ہر اسٹیشن کی طرح یہ اسٹیشن بھی ویسا ہی تھا۔ یہاں سے میرا کوئی جذباتی لگاؤ نہیں تھا۔ لیکن ہاں میرے بہت سے جانے انجانے رشتے یہاں بھی آباد تھے۔ پہلے بھی اور آج بھی، مگر میرے لیے میری اس بہن کے گھر سے زیادہ اور کوئی اہم نہیں تھا۔ ہاں شبلی کالج اور دارالمصنّفین کا تاریخی، ادبی و علمی پس منظر یہاں ضرور موجود تھا۔
مجھے اعظم گڑھ آ کر ایک ایسی شخصیت یاد آئی جس سے مَیں نے چند مہینے کراچی یونی ورسٹی میں اردو پڑھی تھی اور بعد میں مَیں نے انہیں اپنے چند بہترین استادوں میں سے ایک جانا۔ پھر ہم قریب آ گئے اور دوست جیسے بن گئے۔ وہ میرے گھر بھی آنے لگے۔ ہم بہت ساری باتیں کیا کرتے۔ وہ ادب کے شوق میں میری معلومات بھی بڑھاتے اور ادبی ذوق بھی پیدا کرتے رہے۔ وہ انجم اعظمی تھے۔ وہ اس لیے بھی میرے لیے اہم بن گئے تھے کہ وہ علیگ بھی تھے اور رشید احمد صدیقی کے ہونہار شاگرد بھی۔ اب وہ ہندوستان اور پاکستان میں کہیں بھی نہیں۔ اللہ کے پاس جاچکے ہیں۔ مجھے اعظم گڑھ آنے پر بہت یاد آئے۔
یہاں دو روز کا قیام مہمان نوازی کی بہترین مثال تھا۔ شگفتہ اور اعظم دونوں میری پسند ناپسند کے علاوہ آرام کا بھی بہت خیال رکھتے۔ بہن بلقیس مجھے ان کے حوالے کر کے دن میں اپنے اسکول روانہ ہوتیں کہ وہ دن ان کی زندگی کے اہم ترین دن بھی تھے۔ وہ سرکاری ملازمت سے سبک دوش ہورہی تھیں اور اس سلسلے کی ضروری کارروائی کے لیے ان کا اپنے اسکول میں موجود ہونا بہت ضروری تھا۔ مَیں اس بات پر بھی حیران تھی کہ اس نے اتنے دن میرے ساتھ گزارے جو

قاعدے کے مطابق وہ گزار ہی نہیں سکتی تھی۔ میں بھی سرکاری ملازمت سے ہی فارغ ہوئی تھی اور بہتر طور پر جانتی تھی کہ ان دنوں چھٹیاں ممکن ہی نہیں ہوتی ہیں۔ مگر بلقیس نے میری خاطر ان دنوں کو بھی میرے لیے وقف کر دیا۔ میں اس کی مشکور تھی اور ہوں۔

❑

غازی پوراور حسن منزل، میری جائے پیدائش

میرے سفر کا دوسرا سب سے اہم شہر تھا غازی پور۔ اس شہر کی تاریخ تقریباً سات سو سال پرانی ہے اوراس کے آباد ہونے کا قصہ صوبہ سندھ سے ہو بہو ملتا جلتا ہے۔ یہاں کی آب وہوا دور دور سے لوگوں کو لے کر آتی تھی۔ یہاں مدارس بنے، درسگاہوں کا جال بچھا، علماء ومشائخ نے اپنی حکمت سے تاریخ لکھی۔ گلاب کی کاشت نے اسے ہندوستان کا خوب صورت شہر بنا دیا۔ یہاں بڑے بڑے حکمران آئے۔ ادیب شاعر پیدا بھی ہوئے اور دوسرے شہروں سے آکر آباد بھی ہوئے اور دوسرے شہروں کو آباد کرنے گئے بھی۔

یہ شہراس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ یہاں بکسر کی تیسری جنگ لڑی گئی۔ انگریز وائس رائے لارڈ کارنوالس کا انتقال یہیں ہوا اور دفن بھی یہیں ہوا۔ اس شہر کی شہرت اور زرخیزی سے متاثر ہوکر اشوک، ہمایوں، بابر، شیر شاہ سوری، گوتم بدھ، سلیم شاہ، اکبراور علی قلی خان نے اس شہر میں آ کر تاریخ میں نام لکھوایا۔ آئینِ اکبری میں اس شہر کا احوال درج ہے۔

اس شہر کی ادبی حیثیت اس وقت دو چند ہوگئی جب 3 مئی 1862ء کو سر سیّد کا تبادلہ مراد آباد سے غازی پور ہوا۔ وہ بحیثیت سب جج (Sub Judge) یہاں آئے۔ یہاں آ کر سب سے پہلے انہوں نے وکٹوریہ اسکول قائم کیا۔ 9 جنوری 1863ء میں دریائے گنگا کے کنارے لال کوٹھی محلّہ سیال پورہ میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جو بعد میں علی گڑھ یونی ورسٹی کی بنیاد بنی۔

غازی پور کے قیام کے دوران انہوں نے تبیئن الکلام لکھی۔ جس میں کتبِ آسمانی کا تقابلی

مطالعہ پیش کیا۔ تاریخِ فیروز شاہی مرتب کی۔ بعد میں تزکِ جہانگیری بھی تیار کی۔

اپنے نانا نواب فیروز الدّ ولہ کی فارسی تصنیف ''فوائد الافکار فی اعمال الفرجا'' کا ترجمہ اردو زبان میں کر کے غازی پور سے ہی شائع کی۔ سرسیّد کے بیٹے کے لیے مولانا فاروق چڑیا کوٹی نے خطبۂ نکاح لکھ کر غازی پور سے بھیجا جس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں کوئی نقطے والا لفظ نہیں تھا۔

بعدازاں سرسیّد احمد میموریل فنڈ کمیٹی نواب محسن الملک کی سربراہی میں غازی پور آئی۔ یہ بھی ایک تاریخی لمحہ ہے کہ اس کا اجلاس ''صمد منزل'' میں ہوا۔ مولوی عبدالصمد، میرے پردادا حافظ قاری محمد علی جو فارسی اور اردو زبان کے صاحبِ دیوان شاعر تھے، کے سگے بھائی تھے۔ مولوی عبدالصمد کے نام سرسیّد احمد خان نے تقریباً دودرجن خطوط بھی لکھے تھے۔ جو علی گڑھ جانے کے بعد غازی پور صمد منزل کے پتے پر آئے۔ تقسیمِ ہند کے بعد ہمیں نہیں معلوم کہ ان خطوط کو کیوں کر محفوظ رکھا گیا اور اگر نہیں تو یہ تاریخ کی بڑی بھول ہے۔ انہوں نے ''آئینۂ تہذیب'' کے نام سے بھی ایک رسالہ نکالا جو اردو صحافت کے ارتقاء میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور کی غازی پور آمد بھی اس شہر کے وقار میں اضافے کا موجب ہے۔ 1888ء تک انہوں نے یہاں قیام کیا۔ دراصل ٹیگور کی یہاں آمد کی وجہ گلاب تھے۔ گلاب کی کھیتی کی وجہ سے شہرت رکھنے والا یہ شہر گلابوں کے شہر کے نام سے مشہور تھا۔ ٹیگور کو معلوم تھا کہ یہاں کے گلاب برطانیہ، سنگاپور اور جاپان تک جاتے ہیں۔ اس کی خواہش تھی کہ اس پُرسکون اور مہکتے شہر میں بیٹھ کر اپنی ادبی تخلیق کرے۔ یہاں کے قدرتی مناظر اور کھلی فضا میں بیٹھ کر انہوں نے ''درویش کا پیاسا'' نامی گیت لکھا۔ اس کے علاوہ 28 شہرۂ آفاق نظمیں بھی لکھیں۔ ''مانسی'' مجموعہ کلام یہیں مرتب ہوا۔

گیتا نجلی (Desire for a human soul) انگریزی میں لکھ کر بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔ 14 نومبر 1913ء کو ادب کا نوبل انعام ''توکاڈوبی'' ناول لکھ کر حاصل کیا۔ اس کے علاوہ کوی ملک جائسی نے ''پدماوت'' لکھ کر شہرت حاصل کی اور غازی پور کو وقار بخشا۔

اس شہر میں علمی اور ادبی فضا کا یہ عالم تھا کہ یہاں کے رہنے والوں میں شاعر، ادیب اور عالموں کی کثرت تھی۔

شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے 1920ء تک مالٹا میں قید رہنے کے بعد غازی پور کو اپنا مسکن بنایا۔ جس کے بعد مولانا حسین احمد مدنی نے بھی یہاں قیام کیا۔ اس شہر میں عربی فارسی کی تقریباً 22 درسگاہیں اور قرآن پاک کی تعلیم کے لیے 53 مکاتب قائم تھے۔ 200 مساجد تھیں۔ اگر یہ علم وادب کا مرکز نہ ہوتا تب دور دور سے علم کے پیاسے یہاں کیوں آتے اور یہ شہر مردم خیز کیوں کہلاتا؟ یہاں کا مدرسہ چشمۂ رحمت اور مدرسہ دینیہ تاریخ میں مقام کیوں رکھتے؟ کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج وجود میں آیا لیکن اس کے بانی گلکرائسٹ اس سے پہلے غازی پور میں مقیم تھے اور یہاں ہی انہوں نے اُردو انگریزی ڈکشنری تیار کرائی۔

ادیبوں میں سیّد سجاد حیدر یلدرم، آلِ احمد سرور کی تعلیمی زندگی کا آغاز غازی پور سے ہی ہوا۔ اکبرالہ آبادی اور مشہور محقق قاضی عبدالودود نے بھی غازی پور کے قیام میں بڑے معرکے کے کام سرانجام دیے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر بنے جو میرے چچا تھے۔

اس شہر نے ہندوستان کی یونی ورسٹی کو پانچ وائس چانسلر دیے۔ ممتاز حسین، راہی معصوم رضا، علی عباس حسینی کا خمیر یہیں کی مٹی سے اٹھا۔ یہاں بی اماں اپنے ہونہار بیٹے محمد علی جوہر کے ساتھ آئیں۔ یہاں عطیہ بیگم فیضی خواتین کو پردے سے نکالنے آئیں اور ہماری دادی نے ان کے اس عزم کے خلاف جلسے میں اپنی نظم سنائی۔ کاش یہ تاریخی نظم ان کے کلام کے ساتھ محفوظ ہوتی اور مَیں اسے ''کلامِ اشرف'' میں شائع کر پاتی۔ یہاں بھی ہجرت کی تباہی نے اپنا کام دکھایا۔ اور یہ کیا کم ہے کہ سیّد احمد شہید بریلوی کی آمد سے غازی پور جگمگا اٹھا اور بالاکوٹ کے شہیدوں میں سات شہید غازی پور کے تھے جن کے نام بالاکوٹ میں سیّد احمد شہید کے مزار پر آج بھی کندہ ہیں۔

میرے ذہن میں غازی پور کی پوری تاریخ فلم بن کر چل رہی تھی۔

اعظم گڑھ سے دو گھنٹے کی مسافت ہم نے گاڑی میں طے کی۔ اس سفر میں جوں جوں منزل قریب آتی جا رہی تھی میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں اور جب مَیں اپنے ایک عزیز بھائی کے گھر سامان رکھ رہی تھی تب بہت سارے آنسو ایک ساتھ میری آنکھوں سے ٹپک پڑے۔

''تو گویا غازی پور کا اپنا مکان جس کی مَیں وارث تھی، اب میرا نہیں ہے۔'' اس سوچ نے میرے سارے جسم کو کسی مُردے کے جسم میں بدل دیا تھا، وہ بے حس وحرکت تھا۔ آنسو بھی اب آنکھوں

میں جم سے گئے تھے۔ ہونٹ لرز رہے تھے اور کوئی بھی لفظ ادا کرنے سے قاصر تھے۔ مجھ پر یہ کیسی گھڑی آپڑی تھی۔ میرے قدموں نے چلنا کیوں کر گوارا کرلیا تھا کہ ہماری گاڑی ''حسن منزل'' اور ''صمد منزل'' کے درمیان کھڑی تھی۔ مجھے صرف چند سیڑھیوں سے گزر کر اپنے اس مکان میں داخل ہونا تھا جو ہجرت سے پہلے ہمارے اپنے لوگوں سے آباد تھا اور ہجرت کے بعد نامعلوم لوگوں کے پاس تھا۔ میرا یہ سب سے قیمتی سرمایہ تھا جو بن مول بک چکا تھا۔ کون بیچنے والا تھا اور کون خریدنے والا؟ مجھے نہیں معلوم، بس مجھے یہ معلوم تھا کہ گھاٹے میں ہم اور ہماری ماں تھی، جس نے مرتے مرتے اس گھر کو یادرکھا تھا۔ اس گھر میں وہ دلہن بن کر آئی تھی اور بیوہ بن کر بھی رہی تھی۔ اس گھر میں وہ پانچ زندہ رہ جانے اور دوگزر جانے والے بچوں کی ماں بنی تھی۔ یہ گھر جو اس کے مرحوم شوہر کا ورثہ تھا، جس وراثت کی وہ قانونی مالک اور حق دار تھی۔

دولوگوں نے دائیں بائیں پکڑا کر پہلی سیڑھی پر میرے قدم ٹکا دیے، تب میرے جسم میں کرنٹ سا دوڑ گیا۔ ایسے جیسے مَیں ماں کے پیٹ سے باہر آگئی۔ چیخ بلند کی، اپنی آمد کی سب کو اطلاع کی اور سب نے مجھے اپنا ہونے کا یقین دلا دیا۔ مَیں نے یہاں اپنی دوسری چیخ بلند کی۔ ''حسن منزل میری ہے۔ مَیں اس کی مالک ہوں۔'' مَیں نے سامنے کھڑی ایک خاتون سے باآوازِ بلند کہا۔ وہ سمجھ گئیں یہ ہجرت زدہ کوئی عورت ہے اور بے وقوف بھی ہے۔ اپنی ملکیت جھاڑنے یہاں آئی ہے۔ مگر نہیں، اس نے تو خوش دلی سے میرا بازو تھام لیا اور اندر لے آئی۔ ایک ٹوٹا پھوٹا سا کمرہ تھا۔ کمرہ یہ بھی لمبا تھا مگر یہ وہ کمرہ نہیں تھا جس کے چھ دروازے تھے جس کے ایک کونے کی چارپائی سے میری پہلی چیخ بلند ہوئی تھی۔ مَیں بھاگ کر اس کمرے کی طرف جانا چاہتی تھی جہاں کی ایک دیوار پر ایک طاق تھا جس میں میری گڑیا، میری ایک کتاب اور پینسل رکھی تھی جس پر ربڑ بھی لگا ہوا تھا۔ میرے لکھنے کا یہ پہلا سامان تھا جسے مَیں استعمال بھی نہیں کر پائی تھی۔ گڑیا میری یاد میں رو رو کر مرچکی ہوگی مگر شاید پینسل اور کاپی میری منتظر ہوں۔ مگر نہیں، مَیں تو بھاگ ہی نہیں سکتی تھی۔ میری ٹانگوں سے جان کب کی نکل چکی تھی۔ اب آنکھوں نے اپنا کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ پتلیاں تیزی سے متحرک تھیں، جلدی جلدی سارا نقشہ جذب کر لینا چاہتی تھیں لیکن آنکھوں کے سمندر نے سارا نقشہ ڈبو دیا۔ آنسو جذب ہونے کے لیے دوپٹہ ڈھونڈ رہے تھے اور

دوپٹہ تو جیسے جذب کرنے کی ساری صلاحیت کھو چکا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے میرے چاروں طرف کھڑے ہوگئے ۔ بڑے دور کھڑے مجھے اِک ٹک دیکھ رہے تھے۔ مَیں نے محسوس کیا، میرے سارے بہن بھائی میرے ساتھ ہیں۔ اماں بھی سامنے کھڑی ہیں۔ ان کے سارے وجود میں توانائی بھری ہوئی ہے۔ وہ بہت خوش ہیں۔ مَیں نے ایسی خوشی تو ان کے چہرے پر پہلے کبھی دیکھی نہیں۔ مگر کچھ ہی دیر میں اماں نظروں سے اوجھل ہوگئیں۔ بہن بھائی بھی منظر نامے سے غائب ہوگئے۔ بس مَیں تنہا رہ گئی۔ قریب تھا کہ مَیں گر پڑتی، مجھے دونوں طرف سے تھام لیا گیا۔ کہا، چلو اندر چلیں۔ مگر اندر کیا تھا؟ کچھ بھی تو نہیں۔ درجنوں کمروں والی یہ ''کوٹھی'' کھنڈر تھی۔ ایک بھی تو کمرہ سلامت نہیں تھا۔ اس غنیمت کمرے کے آگے ایک برآمدہ تھا جس کے ساتھ ساتھ نالی بہہ رہی تھی۔ یہ ہندوستانی قدیم گھروں کی لازمی ضرورت تھی۔ مگر اس پتلی سی نالی میں جو پانی بہہ رہا تھا، مجھے چھ سات دہائیوں کا پانی محسوس ہوا جو بہہ رہا تھا، بس بہے جارہا تھا۔ مجھے Lord Tennyson کی نظم کا وہ مصرعہ یاد آگیا جو مَیں نے اپنی نصاب کی کتاب میں پڑھا تھا۔

Men may come and men may go

But I go on forever

مَیں نے وہ نالی پھلانگ لی۔ آگے ایک کھنڈر نما چاردیواری تھی جس میں بنے تمام کمرے مسمار ہو چکے تھے۔ میری یادوں میں وہ کمرے، اس میں داخل ہونے کے تمام راستے دھندلے دھندلے آج بھی موجود تھے۔ مگر وہ راستے اب کہاں گئے؟ مَیں نے یہاں تک پہنچنے میں دیر کردی۔ بہت دیر...... وہ وقت اب دوبارہ نہیں لایا جاسکتا۔ مَیں نے زندگی میں اتنا تاسف کبھی محسوس نہیں کیا تھا جیسا کہ اب کر رہی تھی۔ در و دیوار سے انسان کو ہی محبت نہیں ہوتی، انہیں بھی اپنے مکینوں سے اتنی ہی ہوتی ہیں۔ بس ہم انہیں بے جان سمجھ لیتے ہیں۔ اب مَیں سوچ رہی تھی اگر مَیں اس گھر کو دوبارہ تعمیر کراؤں تو قریب قریب ایسا نقشہ ضرور بنا سکتی ہوں جو میری یاد میں آج بھی موجود ہے۔ ایک پانچ برس کی بچی کے ذہن میں۔

مَیں نے ہمک کر کہا، یہاں ایک بارجہ ہوتا تھا۔ جواب ملا، وہ اب بھی ہے۔ مَیں وہاں تک

پہنچائی گئی مگر وہ نقشہ جو میری آنکھوں میں تھا، اب ویسا موجود نہیں تھا۔ ہاں نظر آنے والی وہ سڑک اب بھی باہر سے گزرتی ہے جہاں ہم مونڈھے پر کھڑے کر دیے جاتے تھے جب محرّم کے دنوں میں دس دن تک تعزیے یہاں سے گزرا کرتے تھے۔ مجھے یہ بھی یاد تھا کہ ہمیں ڈوریوں والے بٹوے ملا کرتے جس میں بھُنی ہوئی دھنیا، چھوارے، ناریل وغیرہ باریک کاٹ کر ملائے جاتے۔ یہ سوغات صرف محرّم سے متعلق ہوتی اور ہم خوشی خوشی اپنے ہم جولیوں کے ساتھ مل کر کھایا کرتے۔ ہماری حسن منزل اونچائی پر بنی تھی جبکہ باہر کی سڑک بہت نیچی تھی۔ ہم گزرتے تعزیے نیچے جھک کر دیکھا کرتے۔ تعزیے اب بھی اس سڑک سے گزرتے ہیں۔ ہماری دادی بھی تعزیے میں حصّہ ڈالا کرتی تھیں۔ کہتیں، امام حسینؓ اور محرّم کے ایام کوئی ایک مسلک سے تھوڑی جُڑے ہوئے ہیں۔ مَیں بھی سیّدانی ہوں، بس ماتم نہیں کرتی، غم ضرور کرتی ہوں۔

اب دادی کے نام کا تعزیہ نہیں گزرتا ہوگا۔ میرا جی چاہا منتظمین ملیں تو اپنی دادی کا حصّہ اپنے پرس سے آج ہی چکا دوں۔ نیچے کی منزل اُجڑی پڑی تھی۔ نہ کوئی کمرہ تھا، نہ دالان، نہ باورچی خانہ، نہ ہی صراحی کی گھڑونچی جس پر پھول پہنے صاف ستھرے مٹکے رکھے ہوتے جن پر چاندی کے کٹورے الٹا دیے جاتے۔ میری پیدائش والا کمرہ بھی اپنا نشان مٹا چکا تھا۔ وہ دیوار بھی سلامت نہیں تھی جس میں ایک طاق تھا اور جس میں بیٹھی گڑیا مجھے ٹکر ٹکر دیکھا کرتی تھی۔ میری نظر اس سیڑھی پر پڑی جو ہمیں اوپر کی منزل پر لے جاتی تھی۔ سیڑھی موجود تھی مگر جگہ جگہ سے اکھڑ چکی تھی۔ وہ دروازہ بھی لٹکا ہوا تھا جو سیڑھی پر چڑھنے سے منع کرتا تھا۔ اس دروازے کی کنڈی میں ایک بار میری انگلی پھنس گئی تھی اور باوجود کوشش کے نکلتی ہی نہیں تھی۔ مَیں زور زور سے روئی تھی۔ سارے نوکر چاکر دوڑے چلے آئے تھے۔ تیل لگا کر بحفاظت میری انگلی نکال لی گئی تھی۔ مَیں نے اس کنڈی پر اپنی انگلی رکھ دی۔ چلو ایک نشانی تو موجود تھی، مَیں نے سوچا۔ دو وقتوں کو یکجا کرنے کی میری یہ کوشش کتنی معصوم ہے۔

مگر دو وقت دریا کے دو کنارے ہوتے ہیں بھلا یہ کبھی آپس میں ملے ہیں۔ مَیں نے احتیاط سے انگلی صرف اوپر رکھی تھی کہ جانتی تھی آج اگر میری انگلی پھنس گئی تو نہ مَیں معصوم سی چیخ لا پاؤں گی نہ رفیع اور حنیف نامی ملازم دوڑے دوڑے چلے آئیں گے۔ مجھے وہ دونوں بے اختیار یاد آئے

جن کے چہرے کے نقوش مجھے قطعاً یاد نہیں تھے۔ شاید ان کے بچے یہاں ہوں مگر میں انہیں کیوں کر ڈھونڈ پاؤں گی۔

اوپری منزل پوری کی پوری میرے دادا کی ملکیت تھی جہاں وہ دن بھر لکھتے پڑھتے رہتے مگر شام کے اوقات کا ہلکا سا خاکہ میرے ذہن میں موجود تھا جب وہ دُھلے دُھلائے سفید براق کپڑے پہنے ایک مخصوص آرام کرسی پر بیٹھے ہوتے۔ مجھے لگتا، دادا جیسے کوئی آسمانی مخلوق ہیں اور ان جیسا خوب صورت دنیا میں دوسرا کوئی اور ہے ہی نہیں۔

انڈین ایجوکیشن سروس کا یہ شخص تعلیم سے متعلق ہر بڑے عہدے پر فائز رہا۔ سرسیّد کے بنائے ہوئے چمن میں نواب مزمل اللہ خان، نواب اسمٰعیل خان، نواب محسن الملک، وقارالملک، سرسلیمان اشرف، سرڈاکٹر ضیاء الدین، نواب حبیب الرحمٰن شیروانی جیسے چمکتے دمکتے ہیروں کے ساتھی اور دوست تھے۔ جانے کتنے دینی مدارس کے کفیل اور نگراں تھے۔ یہ ان کا ہی گھر تھا جن کا صرف ایک بیٹا تھا۔ ان ہی کی طرح خوب صورت، خوب سیرت، صاحبِ ثروت، علمیت سے مالا مال مگر اپنے ساتھ عمر کا گوشوارہ لانا بھول گیا تھا۔ صرف چار دہائی دنیا میں پائی مگر علم، اخلاق اور قابلیت کے نقوش ہمیشہ کے لیے دنیا میں چھوڑ گئے۔ میں ان کی ہی ایک بیٹی ہوں۔ آج ان کے گھر کو چھ دہائیوں بعد دیکھنے کے لیے جانے کیوں آ گئی ہوں؟ اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

قدم قدم سیڑھیاں چڑھتے ہوئے صاف شفاف کمرے اور صحن کا تصور پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ میرے پاؤں اس چھت پر تھے مگر سر پر تو چھت تھی ہی نہیں، نہ وہ صاف شفاف کمرہ جس میں کتابیں اور ضروری کاغذات تہہ در تہہ رکھے ہوئے تھے۔ نہ وہ دُھلا دُھلا یا صحن جہاں شام کے وقت غازی پور کی سرکردہ شخصیات کا جمگھٹا ہوتا۔ میری یادوں میں دھیمی دھیمی پُراسراری دھندلی یاد اب بھی موجود تھی۔

دیواروں پر ایسی الماریوں کے آثار تھے جن میں پتھر کی سلیں موجود تھیں۔ زمانے نے انہیں کالا بنا دیا تھا۔ دروازے غائب تھے۔ کھمبے تھے مگر ان میں بھی شکستگی تھی۔ کمروں، دالان کا کوئی نشان موجود نہیں تھا۔ یہاں ایک تخت بھی تھا جس پر ایک سفید گاؤ تکیہ ہوتا تھا جس سے ٹیک لگا کر میرے دادا بیٹھا کرتے۔ میں نے چند قدم اِدھر اُدھر کیے، شاید یہاں رہا ہو۔ میں وہاں کھڑی ہوگئی

بس اسی جگہ ایک شام انہوں نے رسالہ کھلونا مجھے تحفے میں دیا تھا۔ مجھے پڑھنا نہیں آتا تھا پھر بھی انہوں نے اسے میرے نام لگوا دیا تھا۔ مجھے بس ''میاں فولادی'' کی شکل یاد تھی جسے مَیں ہر شمارے میں ڈھونڈتی۔ وہ چوکور خانوں والی شرٹ پہنے ہوتے اور بے حد موٹے ہوتے۔ ان میں اتنی طاقت ہوتی کہ سخت سے سخت چیز سے ٹکرانے پر بھی ان پر کوئی آنچ نہیں آتی جبکہ دوسری چیز پچک جاتی۔ یہ کارٹون نما کہانی مجھے دادا سنایا کرتے اور پھر آخیر میں ہدایت کرتے، ''خود پڑھنا سیکھ لو''۔ مَیں تو بس دو چار شمارے ہی دیکھ پائی تھی کہ ہجرت کے موسم نے سارے مہ وسال مجھ سے چھین لیے۔

میاں فولادی کی شخصیت یاد رہی، بعد کی کہانی سنانے والا کوئی بھی نہیں رہا۔ کھلونا رسالہ تو پاکستان آ گیا تھا مگر شاید میاں فولادی خود ہندوستان میں رہ گئے تھے کہ مَیں نے پاکستانی کھلونا میں انہیں بہت ڈھونڈا، نہیں ملے۔ میاں فولادی ہجرت کی کہانی میں مل جل کر کہیں ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ مَیں نے جب پڑھنا سیکھا اور خصوصاً لکھنا بھی، تب مَیں اس میں کہانیاں لکھنے لگی۔ جی چاہتا تھا دادا کو اپنی کہانی پڑھ کر سناتی، وہ خوش تو ہوتے نا؟

اس سوال کا بھی کوئی جواب نہیں تھا۔ نہ وہ تخت تھا نہ دادا، نہ کھلونا، یہاں مجھے اتنے زور کا چکر آیا کہ اگر میرے دائیں بائیں لوگ کھڑے نہ ہوتے تب حسن منزل کی چھت پر مَیں پہلی شہید کا مرتبہ پا چکی ہوتی۔

کئی گھنٹے بعد کھنڈر نما نامی گرامی کوٹھی حَسن منزل سے رخصت ہو رہی تھی تب ایک مصرعہ میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔

وہ جارہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

وہ شبِ غم تو نہ تھی مگر کسی شامِ غم سے کم بھی نہ تھی۔ بس اسی لمحے مَیں نے سوچا یا محسوس کیا۔

تصوراتی دنیا کی ساری کہانی جو ایک عرصے سے مَیں بُن رہی تھی، ٹوٹ چکی تھی۔ اس لمحے ایک نامعلوم نوکیلی سی کوئی چیز میرے دل کے آر پار ہو گئی۔ اب میری آنکھیں ہی نہیں سارا جسم سمندر بن چکا تھا۔ سفید نہیں سرخ، سرخ خون جیسا، ہاں مَیں نے اپنا دل خون کر لیا تھا اور وہ رِس بھی رہا تھا۔ ہاں آج مَیں حسن منزل سے دست بردار ہو چکی تھی۔

مَیں سیڑھیاں کیسے اتری، گھر سے کیسے نکلی؟ میری آنکھوں کے آگے پردہ تھا جو مجھے کچھ دیکھنے نہیں دے رہا تھا۔ بس مَیں زیرِلب کہہ رہی تھی۔ ''حسن منزل، مَیں اب تم سے دست بردار ہوگئی ہوں۔''

سامنے صمد منزل تھی۔ وہ بھی میرے پردادا کی کوٹھی تھی جہاں 1862ئسے 1864ء کے درمیان سرسیّد احمد خان آتے جاتے رہے۔ صمد صاحب اور حافظ قاری محمد علی صاحب، دونوں شاعر تھے، دونوں اردو فارسی کے شاعر تھے، غازی پور کے رئیس تھے۔ صمد صاحب کے مراسم مرزا غالبؔ سے بھی تھے اور انہیں اپنا کلام سنانے کا شرف بھی حاصل کر چکے تھے۔

صمد منزل میں داخل ہوتے ہوئے مَیں نے فخر اور غرور سا محسوس کیا۔ آباء و اجداد نے اگر نام بڑے اور کارنامے شان دار چھوڑے ہوتے ہیں تب بعد کی نسلیں اسی طرح فخر و غرور کیا کرتی ہیں جیسا کہ آج مَیں کر رہی ہوں۔ اس گھر میں میرے عزیز اب بھی آباد ہیں۔ اختر بھائی کے بیٹے عبید الرحمٰن صدیقی جنہوں نے غازی پور کی تاریخ رقم کی ہے اور تذکرہ مشائخ غازی پور لکھ کر شہرت حاصل کی اور پھر غازی پور کا ادبی پس منظر بھی تحریر کیا، شہر کے ایک کالج میں انگریزی کے استاد ہیں اور اردو میں لکھتے ہیں۔ عبید عمر میں مجھ سے بہت چھوٹے مگر کارناموں میں بہت بڑے ہیں۔ چھوٹے بچوں کی طرح باادب میرے ساتھ ساتھ رہے۔ قلم ہاتھ میں رکھتے ہیں تب دل کی تحریریں پڑھنے میں مہارت ہو ہی جاتی ہے۔ میرے چہرے کے جذبات سے پہلے دلی کیفیت جان لیتے تھے۔ انہوں نے اپنے گھر میں مجھے بہت عزت دی۔ مَیں نے کہا بھی کہ مجھے مہمان نہ جانو، یہ میرا ہی گھر ہے اور اب تم رہتے ہو۔ یوں بھی بعد کی نسل ہی گھر کی حق دار بن جاتی ہے۔ تم ہی جائز حق دار ہو۔ عبید نے اندر باہر صمد منزل کی سیر کرائی۔ وقت گزرنے کے تمام آثار صمد منزل پر بھی چھائے ہوئے تھے مگر وہ قائم تھی۔ کم از کم کچھ کمرے تو جوں کے توں تھے۔ اگر کسی گھر میں اس کے اپنے لوگ رہتے ہیں تب چھت بھی سلامت رہتی ہے اور ستون بھی ایستادہ رہتے ہیں۔ حسن منزل اور صمد منزل کے درمیان یہی دو تفریق تھی قائم رہنے اور مٹ جانے کی۔

عبید نے دوسرے دن شہر کے مشہور ادیبوں اور شعراً کی اچھی خاصی تعداد جمع کر لی۔ مختصر وقت میں میری شان میں ایک بینر بھی بنوالیا اور مہمانِ خصوصی کی کرسی پر بٹھا کر ایک مشاعرہ بھی کر

ڈالا۔ یہ 28 مئی کی ایک شام تھی۔ شام بھی کیسی دھواں دھواں کہ جس شام کے بعد بس ایک اور شام اس شہر میں گزرنی تھی۔

صمد منزل کی یہ شام میرے لیے بہت اہم تھی۔ عبیدالرحمٰن نے شہر کے چند شعرأ کو مدعو کر رکھا تھا۔ عزیز غازی پوری بھاری بھرکم شخصیت کے مالک تھے۔ رنگ صاف اور سفید کپڑوں میں ملبوس خوب صورت لگ رہے تھے۔ یہ مشاعرہ ان کی ہی صدارت میں منعقد ہوا۔ دیگر شعرأ میں محترم بادشاہ صاحب، جناب نظر غازی پوری، نفیس عالم ہنٹر، رئیس شاہدی، سیف الرحمٰن صاحب جنہوں نے نظامت کے فرائض بھی ادا کیے۔ سامعین میں میرے علاوہ اختر بھائی، عبیدالرحمٰن، میری بہن بلقیس جو ہندوستان میں قیام کے دوران میری میزبانی خلوصِ دل سے کرتی رہیں اور ایک اہم شخصیت بھی شریکِ محفل تھی، وہ تھے جناب رام جی کیسری جو عطر کیوڑہ گویا خوشبو بنانے کے ماہر تھے۔

مَیں نے کالج میں تدریس کے دوران چالیس سال میں کم وبیش چالیس مشاعرے منعقد کرائے۔ سال بہ سال ان مشاعروں کی دھوم شہر کراچی میں یوں ہوئی کہ بہت ساری روداد شائع ہوئی۔ اخباروں میں کالم لکھے گئے اور مختلف بیٹھک میں تبصرے ہوئے۔ اس کا معیار، انتظام، طالبات کا ڈسپلن اور داد دینے کا طریقہ موضوعِ گفتگو رہا۔ شبنم رومانی کالم بھی لکھتے تھے اور برابر ہر سال مشاعرے میں تشریف بھی لاتے تھے۔ ایک کالم میں انہوں نے لکھا۔ ''سکون سے کلام سنانا ہو۔ ادب اور شوق کے ساتھ داد وصول کرنی ہو اور اپنا شاندار استقبال اور احترام کرانا ہو تو علامہ اقبال گرلز کالج کے مشاعرے میں شرکت ضرور کریں۔'' میرے اور میری طالبات کے لیے ان کی رائے کتنی تقویت بخش ہوگی، اندازہ کرلیں۔ سال بھر مشاعرے کا تذکرہ شہر میں ہوتا رہتا اور اگلے سال کا انتظار رہتا۔ اگر کسی مشاعرے میں کوئی شاعر مدعو نہ ہوتا تب وہ سال بھر شکوہ کرتا پایا جاتا اور مَیں معذرت کرتے کرتے سال گزارتی۔

اس مختصر سی نشست میں بیٹھے بیٹھے مجھے اپنے کالج کے مشاعرے کی یاد آ گئی جہاں شاعروں کی تعداد بیس پچیس کے قریب ہوتی اور حاضرین کی تعداد ہزار سے ہرگز کم نہ ہوتی۔ اسٹیج خوب صورت بینر کے علاوہ مختلف طریقوں سے اس قدر سجا ہوتا کہ کسی شادی کے اسٹیج سے کم حسین نہ

ہوتا۔ مگر آج کی یہ مختصری نشست چند شعرأ اور دو چار سامعین، حاضرین کے باوجود میری یادوں میں ایک خوبصورت یاد بن کر محفوظ ہوگئی جہاں اختر بھائی کا خلوص بھی تھا، عبید کی بے انتہا محبت بھی اور مختصر عرصے میں شہر غازی پور کے چیدہ چیدہ شعرأ کا جمع ہوجانا بھی۔ کس کے لیے؟ ایک ایسی شخصیت کے لیے جو اُن کے لیے اجنبی تھی، مگر ہاں پیدائشی اسی شہر کی اپنی تھی۔

تمام شعرأ نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ اپنی عادت کے برعکس مَیں ان کے اشعار نوٹ نہیں کر سکی کہ مَیں تو بس جذبات کے ہجوم میں گم ہی تو تھی۔

رام جی کیسری شاعر نہیں تھے۔ بس میری طرح تھے مگر مشاعرے سے جُڑے ہوئے تھے۔ آخیر میں بولے۔ مَیں شعروشاعری سے شغف نہیں رکھتا، مَیں تو بس خوش بو کا تاجر ہوں۔ ہم سب چونک پڑے۔ ان کا یہ ایک جملہ بھی نظم کی ایک لائن سے کم نہیں تھا۔ پھر انہوں نے غازی پور کی گلاب والی خصوصیت بتاتے ہوئے ایک ایک شیشی گلاب کے عطر کی ہم سب کو تحفتاً پیش کی جسے انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔

ان کا کہنا تھا ایک من گلاب کی پتیوں سے صرف دو انچ کی شیشی میں اس کا عرق بھرا جاتا ہے جو ایک دم خالص ہوتا ہے اور جس کی قیمت 20 ہزار روپے ہے۔ باقی رہا بکنے والا عطر، اس میں ملاوٹ ہوتی ہے کہ اتنی مہنگی شیشی بھلا ہر کوئی تو خرید نہیں سکتا۔ ملاوٹ شدہ عطر بھی اس قدر خالص ہوتا ہے کہ کپڑا کئی بار بھی دُھلے، خوشبو غائب نہیں ہوگی۔ ٹیسٹ کے طور پر میری آستین پر انہوں نے ایک سلائی پھیر دی۔ خوش بو تھی کہ کمرے میں اس طرح پھیل گئی جیسے ابھی کچھ دیر پہلے شعرأ اپنے کلام سے پھیلا رہے تھے۔ مَیں نے عقیدت سے مغلوب ہو کر کہا، ''رام جی کیسری صاحب، کون کم بخت اس آستین کو اب عمر بھر دھوئے گا۔'' انہیں اپنے عطر کی یہ داد بہت پسند آئی۔ بعد ازاں انہوں نے کیوڑے کا کمال کچھ اس انداز میں دکھایا جیسا کہ جادوگر محفل میں اپنا ہنر دکھایا کرتے ہیں۔ کان میں کچھ ڈالتے ہیں اور منہ سے وہی کچھ نکال لیتے ہیں۔

کیسری صاحب نے شیشے کے ایک گلاس میں پانی منگایا۔ کیوڑے کی چھوٹی سی شیشی میں سے ایک سلائی نکالی اور اس بھرے گلاس میں ڈبو دی اور دعویٰ کیا کہ پورا گلاس کیوڑہ بن گیا ہے۔ گویا بالکل خالص کیوڑے کی سلائی نے بھرے گلاس میں جادو جگا دیا۔ ہم سب نے وہ پانی سونگھا۔

ہر ایک ناک نے بالکل کیوڑے کی مہک محسوس کی۔

رام جی کے ان کمالات نے محفل کا رنگ دوبالا کر دیا۔ جی نہیں چاہتا تھا کہ یہ نشست برخاست ہو۔ اپنے شہر میں ان لوگوں سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ اگرچہ یہ لوگ حسن منزل کے حوالے سے ان کے مکینوں کی داستان سنے بیٹھے تھے لیکن ان داستانوں میں بھلا ہمارا ذکر کہاں رہا ہوگا کہ ہم تو بچپن ہی میں شہر بدر ہو گئے تھے۔ مَیں نے ہر ایک کے چہرے کو اپنی آنکھوں میں بند کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں کامیاب بھی ہوئی کہ آج بھی آنکھیں بند کرتی ہوں اور انہیں دیکھ لیتی ہوں۔ ان تمام شعراُ کی شاعری کمال کی تھی۔ اچھا لگا، اس شہر کی آب و ہوا نے شاعری کے حُسن کو اب بھی محفوظ رکھا ہوا ہے۔

آخیر میں حسبِ روایت ناظم نے ہم سے ہمارا کلام سننے کی فرمائش کر ڈالی۔ مَیں کلام کیا سناتی؟ بس یہی کہہ سکی کہ میرا سارا کلام چوری ہو گیا۔ وہ سب ایک ساتھ چونک گئے۔ میری ہمدردی میں ہر ایک کے چہرے مرجھا گئے تھے مَیں نے سنجیدگی سے کہا، میرا کلام علامہ اقبال نے چوری کر کے اپنے نام کر لیا۔

سب یک دم ہنس پڑے۔ ایک شاعر نے شوخی سے کہا، کچھ تو یاد ہوگا بس وہی سنا دیں۔ مَیں نے ایک شعر پڑھ دیا۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تُو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

اس شعر پر مجھے بہت داد ملی۔ سمیٹے نہیں سمٹ رہی تھی۔ شاید علامہ اقبال کو بھی اس شعر پر اتنی داد نہیں ملی ہوگی۔ پھر مَیں نے بہت ساری باتیں کیں۔ پاکستان کے بارے میں، یہاں کی محفلوں، یہاں کے ادب، شعروشاعری، شاعر اور ادیبوں کے بارے میں، اپنے پسندیدہ لوگوں کے بھی بارے میں۔ یہاں کی طرزِ رہائش، گفتگو، علم اور تدریس کے بارے میں، اپنے کالج کے بارے میں، اپنے لوگوں کے بارے میں جسے وہ لوگ کمالِ شوق سے سُن رہے تھے۔ پھر مجھے ایک دم ان لوگوں نے شرمندہ کرنا شروع کر دیا۔ ہر ایک اٹھتا میرے گلے میں گیندے کے پھولوں کے ہار ڈال دیتا۔ مسکراتا، محبت سے دیکھتا۔ اختر بھائی اور عبید نے تو بس یہ چاہا کہ ایک نہیں کئی کئی ہار پہنا دیں۔ مَیں

سوچ رہی تھی، میرا کیا کمال تھا کہ یہ استقبال تھا۔ زندگی میں کتنے ہی لوگ صرف ایک بار ملتے ہیں۔ پہلی ہی بار ملتے ہیں۔ بغیر کسی رشتے کے ملتے ہیں اور بقیہ تمام زندگی کسی نامعلوم رشتے میں جُڑ جاتے ہیں۔ بُھلائے نہیں بھولتے۔ یہ لوگ بھی ان ہی لوگوں میں سے تھے۔ میرے اپنے شہر کے لوگ تھے جن سے مَیں پہلی بار مل رہی تھی، اگلی بار کی کوئی امید نہیں تھی۔

وقت گزر جاتا ہے، وقت گزر گیا۔ مَیں نے اپنی کتابیں دیں۔ عبید نے اپنی کتاب مجھے دی۔ کتابوں کے یہ تحفے بھی کتنے قیمتی ہوتے ہیں۔ زندگی کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں، ہم دنیا سے گزر جاتے ہیں، یہ شیلف پر رکھے رہ جاتے ہیں۔ پڑھنے والا فانی ہوتا ہے، پڑھی جانے والی کتاب رہتی دنیا تک رہتی ہے۔ سچ ہے جو حرف لکھا گیا، وہ رہ گیا۔

رات گئے مَیں صمد منزل سے روانہ ہوئی۔ اندھیرے میں ڈوبی حسن منزل پر بھی نظر ڈالی۔ کاش مَیں اسی گھر میں پلی بڑھی ہوتی۔ اسی شہر میں رہتی۔ اُس لائبریری کی ساری کتابیں پڑھ ڈالتی جو حسن منزل کے ایک کمرے میں قائم تھی۔ جانے کون کون سی کتابیں رہی ہوں گی۔ کتنے نایاب نسخے ہوں گے۔ کن کے قلم سے لکھے گئے ہوں گے، کن کن کی نظروں سے گزرے ہوں گے۔ وہ کتابیں، وہ نسخے، وہ کاغذات، سب کیا ہوئے؟ کہاں گئے کہ حسن منزل میں تو اب کوئی کمرہ بھی باقی نہیں بچا ہے۔ وہ اگر چھت تلے دب گئے، مٹی میں مل گئے، بارش میں بہہ گئے تو انہیں بچانے مَیں کیوں نہ آ پائی؟ ان ملبے تلے دبی کتنی چیخیں میرے کانوں میں سنائی دینے لگیں۔ مَیں نے دونوں ہاتھوں سے کان بند کر لیے، دونوں آنکھیں موند لیں۔ دونوں پاؤں حسن منزل سے مخالف سمت میں کر لیے اور ایک بار پھر اسے چھوڑ دیا۔ مَیں تو پہلے ہی کہہ کر آئی تھی "حُسن منزل، آج میں تجھ سے دست بردار ہوتی ہوں۔" مَیں نے ایک بار پھر اسی جملے کو دہرایا۔

وہ رات غازی پور کی ہی ایک رات تھی۔ مَیں نے اس رات کو بھرپور طریقے سے محسوس کیا۔ بجلی نہیں تھی، گرمی غضب کی تھی۔ پانی بھی ٹھنڈا نہیں تھا مگر مجھے کچھ بُرا نہیں محسوس ہو رہا تھا۔ ایسی تمام حِس سے مَیں عاری تھی۔ زندگی میں کبھی کبھی ایسے بھی مقام آتے ہیں، مگر کیوں آتے ہیں؟ اس رات مَیں نے صمد منزل کی نشست کو بار بار یاد کیا۔ اب یہ یاد زندگی کے آخری لمحوں تک مٹائے نہیں مٹ پائے گی کہ اب کون سی ڈھیروں دہائیاں باقی بچی ہیں۔ مَیں اپنی یہ یاد تحریر کے

ذریعے اپنی موجودہ اور آیندہ آنے والی نسلوں کے لیے چھوڑے جارہی ہوں۔ مجھے خوش فہمی ہے بھی اور نہیں بھی کہ اب بچے خوشی خوشی نئی نئی ہجرتوں پر روانہ ہوجاتے ہیں۔ ماضی یادرکھنے کے لیے نہیں بھول جانے یا بھلادیے جانے کے لیے ہوتا ہے۔

مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

ہماری نئی نسل یادرکھنے اور بھول جانے جیسے جذبے میں ہم سے یکسر مختلف ہے۔ میرے گھر میں میری کتابیں شیلف پر رکھی رہیں گی۔ بچے کسی دوسرے ملک میں تیسرے درجے کے شہری بن کر زندگی گزار رہے ہوں گے۔ اسی پر اکتفا نہیں، کبھی کسی ذہن میں فتوحات کا سودا سمائے گا تو ایک دن اس گھر میں بھی آئیں گے۔ گرد سے اٹی کتابیں انہیں کباڑ محسوس ہوں گی۔ سب سے پہلے وہ انہیں رڈی والے کے حوالے کریں گے۔ پھر کرسی میز نکال کر گھر پر برائے فروخت کا بورڈ آویزاں کردیں گے۔ جیسے ''حُسن منزل'' نہیں رہی ''نور گھر'' بھی نہیں رہے گا۔ زندگی میں سب کچھ رہنے کے لیے ہی تو نہیں، فنا بھی نہ فنا ہونے والی حقیقت ہے۔

غازی پور میں دیکھنے کے کئی مقام تھے اور سوچنے کے بہت سے موضوعات، مگر گھنٹے کم پڑ گئے۔ آفت کی گرمی۔ قیامت کی لوڈ شیڈنگ، دل میں اٹھنے والا طوفان، مَیں اپنے وجود میں بچی بھی کہاں تھی۔ مگر ذہن دل سے کہہ رہا تھا کچھ اور جگہیں تو دیکھ لو۔

کچھ اور جگہوں میں ایک مدرسہ دینیہ، دوسرا مدرسہ چشمۂ رحمت تھا۔ یہ دونوں درسگاہیں بھی ہمارے آباؤ اجداد کے دم قدم سے آباد تھیں۔ مدرسہ دینیہ وہ مدرسہ تھا جو بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں قیام پذیر ہوا اور جس کا پہلا سالانہ جلسہ 15 فروری 1936ء کو ہوا جب میرے والد کی عمر صرف 31 سال تھی اور غازی پور علماء سے بھرا ہوا تھا۔ ایک سے ایک عالم اس شہر میں موجود تھے مگر قرعۂ فال میرے والد کے حق میں نکلا کہ وہ بہ حیثیت صدر استقبالیہ کمیٹی خطبۂ صدارت پیش کریں۔ یہ خطبہ شائع بھی ہوا تھا اور جانے کس طرح اس کی ایک کاپی عمر بھر سے میرے پاس محفوظ تھی جسے مَیں نے اپنی حالیہ تصنیف ''کلامِ اشرف کمالِ حسن'' میں شائع بھی کردیا ہے۔

مَیں کبھی خواب وخیال میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ مَیں اس مدرسے میں قدم رکھوں گی اور اگر کبھی جا بھی پائی تب ہرگز یوں نہ جانی پہچانی جاؤں گی کہ مَیں اسی نوجوان کی بیٹی ہوں جس نے

اس عظیم مدرسے میں پہلا خطبۂ صدارت پڑھا تھا۔ مگر میری قسمت نے مجھے وہاں پہنچا دیا۔ اللہ کے فضل و کرم سے نہ صرف وہ مدرسہ آج بھی قائم ہے بلکہ پہلے سے زیادہ دین کی خدمت کر رہا ہے۔

غازی پور کے سب ہی ضلع اور تحصیل میں چھوٹے بڑے نصف درجن سے زائد مدرسے قائم کئے ہوئے ہیں اور اب اس کے موجودہ مہتمم عزیز الحسن صدیقی صاحب ہیں جو نہ صرف دینی عالم ہیں بلکہ کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ ان کی ایک تصنیف ''مشاہیرِ غازی پور'' مجھے پاکستان ہی میں مل چکی تھی اور مجھے ان سے ملاقات کی شدید خواہش بھی تھی۔

اب جبکہ مَیں اسی شہر میں تھی مجھے وہاں جانا ضرور تھا۔ مَیں مدرسۂ دینیہ تو اپنے ابا اور دادا کے نقشِ قدم تلاش کرنے ہی گئی تھی لیکن کرنا یہ ہوا کہ وہاں عزیز الحسن صاحب سے ملاقات ہوگئی جس کا مجھے ہرگز علم نہیں تھا کہ وہ وہاں کے مہتمم بھی ہیں۔

جب مَیں ان کے سامنے یا وہ میرے سامنے آئے تو میرا جی چاہا کہ فرطِ عقیدت سے اپنا سر جھکا دوں اور مَیں نے دل کی بات مان بھی لی۔ ویسے بھی ان کی شخصیت کا حُسن ایسا ہی تھا جہاں احترام کا جذبہ امنڈ آتا ہے۔ سفید کپڑوں، سفید داڑھی، سفید ٹوپی میں عزیز صاحب مجھے بے حد عزیز لگے۔ میرا تعارف ان سے عبید نے کرایا۔ بقیہ تعارف وہ خود مجھ سے کرانے لگے۔ وہ میرے تمام آباء و اجداد کو جانتے تھے۔ ان کے کارناموں سے بھی آگاہ تھے بلکہ ان کے کام کے بارے میں تحریر بھی کرتے رہے تھے۔ وہ مجھ سے زیادہ میرے ابا اور دادا سے آگاہ تھے۔ ان کی آنکھوں میں ان کی شبیہ موجود تھی۔ ان کی آنکھیں میرے لیے بہت اہم بن گئیں۔ مدرسۂ دینیہ کی خدمات سے انہوں نے آگاہ کیا بلکہ ہمارے اجداد جو حصّہ اس کے قیام اور اس کے بعد بھی ڈالتے رہے تھے، مجھے بتاتے رہے۔ پھر مجھے ابوالحسن صدیقی لائبریری لے گئے جو ان کے والد کے نام سے قائم ہے۔ مَیں نے مذاقاً کہا بھی، اسے آپ اپنے والد کے نام سے سمجھئے، مَیں اسے اپنے دادا کے نام سے سمجھے لیتی ہوں۔ ان کی خوب صورت مسکراہٹ میں پسندیدگی بھی تھی۔

مگر جب انہوں نے ایک شوکیس میں جھانکنے کے لیے کہا تب مَیں نے تابعداری تو کی لیکن اس میں رکھا خطبۂ صدارت مجھے چونکا گیا۔ ''یہ تو میرے ابا کا ہے، یہاں محفوظ ہے؟'' حیرت اور خوشی دونوں میرے لہجے میں برابر کی شریک تھی۔ مَیں نے کہا، بس میرا یہاں آنا بھی معجزہ ہے۔

قدرت مجھے اپنے لوگوں سے خود قریب کر رہی ہے۔ پروردگار کا شکر ویسے بھی واجب ہے مگر اس لمحے تو مَیں کھڑی کھڑی سجدے میں گر گئی۔ اپنے ابا کے لکھے وہ اوراق آج بھی یہاں محفوظ ہیں۔ انسان فانی ہے، چلا جاتا ہے۔ چیز رہ جاتی ہے۔ کام اور نام باقی رہ جاتا ہے۔ میری آنکھوں میں جو آنسو امنڈ آئے وہ خوشی کے تھے جنہیں مَیں نے اپنے ابا کے حضور پیش کر دیا۔

عزیز الحسن صاحب، یہ کیا کچھ دکھا دیا آپ نے؟ بہت شکریہ کہ آپ لوگوں نے اسے یہاں محفوظ کر رکھا ہے۔

دوسری بار انہوں نے مجھے پھر چونکایا۔ ایک رجسٹر میرے سامنے تھا جس میں یہاں آنے والے بڑے بڑے لوگوں کے تاثرات تحریر تھے۔ مَیں انہیں پڑھنے لگی۔ نہیں، عزیز الحسن صاحب نے کہا، پڑھنے کے لیے نہیں ہے ہمیں آپ کے تاثرات اس رجسٹر میں چاہیئں۔ شدید گرمی میں میرا سارا جسم سردی سے منجمد ہو گیا۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ مَیں بے اختیار بول پڑی۔ سرسری نظر سے میں جن شخصیات کے نام پڑھ پائی تھی اس کے بعد تو ہرگز نہیں۔ مَیں یہ جرأت کیوں کر کروں؟

عزیز الحسن صاحب کی خواہش یا ضد یا پھر یہ کہ شاید وہ میرا دل ہی رکھنے کے لیے یہ درجہ دینا چاہ رہے ہیں۔ مَیں نے اپنے قلم سے نہیں، اپنی آرزوؤں اور اپنے آنسوؤں سے چند سطریں تحریر کر دیں جواب مجھے یاد بھی نہیں۔ زندگی بعض اوقات کیسے کیسے اَن مول لمحے اچانک بن مول عطا کر دیتی ہے۔ مَیں نے انہیں اپنے دل میں، اپنی آنکھوں میں، اپنی یادوں میں سینت کر رکھ لیا۔

کتاب ''مشاہیرِ غازی پور''، چند مجلّوں جو مدرسۂ دینیہ کی خدمات کے ذکر کے طور پر تھے، مجھے عطا کیے جسے ساتھ لے کر مَیں اپنے وطن آئی ہوں۔ وقت بہت کم تھا۔ ملاقات بہت تشنہ تھی۔ جی چاہتا تھا ابھی نہ اٹھوں پھر جانے کس کی زندگی کب ختم ہو جائے۔

کراچی آ جانے کے بعد بھی مَیں انہیں یاد کرتی رہی۔ ان کی شخصیت کا سحر مجھ پر اب تک طاری ہے۔ وہ مجھے چونکانے سے اب بھی باز نہیں آ رہے۔ ایک رسالہ سہ ماہی کاروانِ ادب جو لکھنؤ سے نکلتا ہے، اکتوبر تا دسمبر 2013ء اور جنوری تا جون 2014ء بھی پکڑا دیا تھا جسے بغیر مطالعہ کیے مَیں اپنے ہمراہ لے آئی تھی۔ جب آخر کھولا تو اس میں میرے دونوں پردادا حافظ قاری محمد علی

اور مولوی عبدالصمد پر مضمون شائع ہوا ہے۔ قاری محمد علی پر مولانا سعودالحسن استاد مدرسۂ دینیہ، کا مضمون ہے جو عزیزالحسن صاحب ہی کے صاحب زادے ہیں جن سے مَیں نے مدرسے میں ملاقات بھی کی تھی اور جنہیں عزیزالحسن صاحب کی شبیہ محسوس کیا تھا۔

صمد صاحب پر مولانا مشکور عالم کا مضمون ہے۔ وہ بھی مدرسۂ دینیہ کے ہی استاد ہیں جن سے میری ملاقات نہیں ہوسکی تھی۔

یہ کیا اتفاق ہے کہ جس مہینے میں مَیں غازی پور پہنچی ہوں، اسی سال، اسی ماہ کے رسالے میں میرے آباء واجداد کا ذکر ہے۔ بس یہ سب غیب ہے اور مشیتِ ایزدی کے سوا کیا ہوسکتا ہے۔

چونکانے والی ایک اور تحریر جو پاکستان واپس پہنچنے کے بعد مجھے بھیجی گئی، وہ ہے مدرسۂ دینیہ اسلامیہ کے پانچویں سالانہ جلسہ کی روداد جو 26، 27 اور 28 اپریل 1952ء کو منعقد ہوا۔ صدارتی خطبہ جناب انوارالحسن صاحب میونسپل کمشنر نے پڑھا۔

میرے والد کے خطبۂ اوّل کے بعد یہ پانچواں خطبۂ صدارت تھا۔ یقیناً وہ اب حیات نہیں ہوں گے۔ مَیں نے ان کے حق میں دعائے مغفرت کی مگر چونکا دینے والی وہ تحریر تھی جو میرے دادا کی تھی، جنہوں نے جلسہ کے سلسلے میں اپنے تاثرات بیان کیے تھے اور جو وہاں اب بھی محفوظ ہے۔ وہ تاثرات مَیں یہاں اس لیے نقل کر رہی ہوں کہ وہ میرے اس سفرنامے کے ذریعے کتاب میں محفوظ ہوجائیں۔ اس تحریر کے ساتھ منتظمین کا شکریہ بھی منسلک ہے۔ جو کچھ یوں ہے۔

''ہم مولوی حاجی ابوالحسن صاحب آئی ای ایس ریٹائرڈ کے بالخصوص شکر گزار ہیں جنہوں نے نہ صرف ہر ایک اجلاس میں شروع سے آخیر تک شرکت فرمائی بلکہ اس پر اپنے تاثرات بھی قلم بند کر کے عنایت فرمائے۔''

بھلا مَیں کب یہ تحریر دیکھ پاتی یا اس تاریخی جلسے کی روداد پڑھ پاتی جو عزیزالحسن صاحب نے فوٹو کاپی کر کے مجھے پاکستان بھیج دی۔ لفظ شکر یہ ایسے ہی موقع پر جذبات کی عکاسی مکمل طور پر نہیں کر پاتا۔ مگر مَیں نے جب انہیں رسماً شکریے کا فون کیا تب انہوں نے ایک اور چونکا دینے والی بات کی۔ انہوں نے بتایا، میرے دادا مولانا ابوالکلام آزاد کے ہم شکل تھے اور غازی پور میں لوگ انہیں ہم شکل کہا بھی کرتے تھے۔ وہی سرخ وسفید رنگ، شیروانی اور ٹوپی، ویسی ہی داڑھی۔ اس

دور کے شرفا کی شکل شاید ایک جیسی ہی ہوتی تھی۔ عزیز الحسن صاحب نے میرے دادا کے پاکستان آنے پر اپنے گھر رکھی ہوئی تقریب کا بھی ذکر کیا جو ان کے ہم نام والد ابوالحسن صاحب نے دوسرے ابوالحسن کے لیے منعقد کی تھی۔ اصرار تھا کہ وہ ایک وقت کھانا ان کے ساتھ کھائیں۔ اس موقع پر ان کے والد نے فارسی میں ایک نظم بھی کہی تھی جس کا صرف ایک شعر انہیں یاد رہ گیا تھا اور نظم زمانے کی نذر ہو چکی ہے۔ وہ شعر انہوں نے مجھے سنایا بھی مگر ایک تو وہ فارسی زبان میں تھا دوسرے فون کی لائن پُرشور تھی۔

مَیں نے بطورِ خاص اِن سے غازی پور کے قبرستان کے بارے میں پوچھا۔ مجھے اپنے چودہ سالہ چچا اور چودہ ہی سالہ بہن کی قبروں کی تلاش تھی اور مجھے یقین تھا کہ میری پیدائش سے پہلے کی یہ دونوں ہستیاں اب قبر کی صورت میں بھی مجھے نہیں مل سکتیں۔ مگر عزیز الحسن صاحب نے یہ اطلاع دے کر مجھے چونکا دیا کہ میرے ایک عزیز حکیم ولی الدین کے احاطے میں ایک قبر انہوں نے برسوں پہلے دیکھی تھی جس پر میرے دادا کے نام کی تختی لگی تھی۔ میرا تڑپ جانا فطری تھا۔ مَیں اس احاطے کو ڈھونڈتی ہوئی گئی بھی مگر وہ نہ مل سکی۔

یہ کام میں عزیز الحسن صاحب کے ذمے چھوڑ آئی تھی۔ انہوں نے میری خاطر اپنی دی ہوئی اطلاع پر وہاں تک جانے کی زحمت بھی اٹھائی مگر قبضہ کر لینے والوں نے قبریں مٹا کر اپنا گھر تعمیر کر لیا ہے اور ان قبروں کے نشان پر چل پھر رہے ہیں۔ آس بندھ کر ٹوٹ گئی۔ یقیناً یہ قبر ان ہی دونوں میں سے کسی ایک کی ہوگی۔ ایک کے وہ والد تھے دوسری کے دادا، خود میرے دادا پاکستان میں دفن ہیں اور میرے ابا علی گڑھ میں، سو یہ دونوں بے نام، گمنام ہی رہے۔ اس شہر جا کر بھی مَیں ان کے سرہانے کھڑی نہیں ہو پائی۔ مَیں نے ان دونوں سے معافی مانگ لی اور علی گڑھ یونی ورسٹی کے قبرستان کا شکریہ ادا کیا جس نے میرے ابا کو گمنام، بے نام نہیں رہنے دیا اور مدتوں بعد مَیں حاضری بھی دے آئی۔

مدرسۂ دینیہ سے مَیں یہ سوچتے ہوئے رخصت ہوئی تھی کہ یہ روئے زمین پر ایک ایسے نقطے کے مانند ہے کہ جہاں سے لگتا ہے اس سے وابستہ لوگ اکٹھے جنّت کا رخ کریں گے۔ ان کی ہجرت دنیا سے آخرت کی ہجرت ہوگی، وہ بھی آخرت میں جنّت الفردوس کے مقام تک کی۔ اللہ کرے ایسا

ہی ہو۔ اور اللہ کرے ایسا بھی ہو کہ ہم اور ہمارے آباء و اجداد بھی ان کے ساتھ ہوں۔

مدرسہ دینیہ کے سلسلے میں جو معلومات لے کر میں لوٹی وہ مختصراً کچھ یوں ہے کہ اس مدرسے کو مولانا عمر فاروق نے 1350 ہجری میں قائم کیا۔ آج یہاں کے تعلیمی شعبے میں عربی، حفظ و تجوید، پرائمری تعلیم، جونیئر سیکشن، شعبۂ نسواں ہائی اسکول کوچنگ برائے طالبات کے علاوہ چلڈرن ہوم بھی چل رہا ہے۔ رفاہی شعبے کچھ یوں ہیں۔ تبلیغ و اشاعت، افتاء مجلس شرعی دینیہ اکیڈمی۔ گشتی لائبریری، مولانا ابوالحسن لائبریری، کمپیوٹر سیکشن، اصلاحِ معاشرہ کمیٹی، وفاق مدرسہ اسلامیہ، شعبہ تدفین لاوارث میّت، سمر اسلامک کیمپ، اسلامی ہوسٹل، شعبۂ خدمتِ خلق اور دیگر شعبے بھی۔

دینیہ مدرسے کی براہِ راست شاخیں دس عدد ہیں۔ ملحقہ و مربوط مدارس و مکاتب کی تعداد 28 کے قریب ہے۔

یہاں سے دو جرائد تذکیر اور دین و دعوت کے نام سے نکلتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک سالانہ میگزین آگہی کے نام سے بھی جاری ہے۔

یہاں تقریباً 48 اسٹاف ممبر ہیں جو درس و تدریس سے متعلق ہیں۔ تبلیغی کام سے جڑے ہوئے پانچ افراد ہیں۔ غیر تدریسی عملے کی تعداد بارہ ہے اور ملحق مکاتیب کی تعداد 38 ہے۔ طالب علموں کی تعداد دو ہزار تین سو کے قریب ہے۔ جن میں سے 25 طالب علم ہوسٹل میں رہتے ہیں۔ یہاں حفظِ قرآن کے ساتھ عربی تعلیم لازمی ہے۔ چھٹی جماعت تک یہاں کا سالانہ خرچ تقریباً 39 لاکھ ہے۔ حکومت سے کوئی امداد نہیں لی جاتی صرف مخیّر حضرات خرچ برداشت کرتے ہیں۔

دوسرا مدرسہ چشمۂ رحمت تھا جسے دیکھنے کا مجھے شوق تھا۔ بچپن سے میں اس کا نام سنتی آئی تھی۔ میرے بڑے بھائی کی ابتدائی تعلیم وہیں ہوئی۔ وہ بڑے خوش قسمت تھے کہ مولانا عمر فاروق سے انہوں نے اپنی تعلیم کی ابتدا کی تھی جو مدرسہ چشمۂ رحمت کے بانی استادوں میں سے ایک تھے۔ جن کے ساتھ وقت کے بڑے بڑے علمائے کرام نے اس مدرسہ میں علمیت کے چراغ جلائے۔ اور جس کا قیام 1869ء میں مولانا رحمت اللہ فرنگی محلی کے ہاتھوں ہوا۔ چشمۂ رحمت کی شاندار عمارت وہ عمارت نہیں جو ہمارے آباء و اجداد کے زمانے میں تھی۔ یہ وہ مدرسہ تھا جن سے وابستہ علماء آج تاریخ کے نگینے بنے ہوئے ہیں۔ جن کی خدمات سے غازی پور فخر سے سر اٹھائے ہوئے ہے۔ اس

عمارت کے صدر دروازے پر کھڑے کھڑے مَیں نے سر اونچا اور نظریں نیچی کر لیں۔ سر فخر سے اونچا تھا اور نظریں احتراماً نیچی۔ اپنے لوگوں کے بارے میں خاندان کے بزرگوں سے بہت کچھ سن رکھا تھا، آج وہ کہانیاں اپنے مقام پر یاد آ رہی تھیں۔ بچوں کو بڑوں سے ماضی کے قصے ضرور سننے چاہئیں، ماضی حال کو قوت اور مستقبل کو اطمینان بخشتا ہے۔

میرے دل کو کس قدر سُرور اور اطمینان تھا، یہ مَیں ہی جانتی تھی۔ مجھے اپنی کم علمی اور کم مائیگی پر شدت سے ندامت محسوس ہوئی۔ مَیں پھر اپنے آپ سے کہہ اٹھی۔

تھے وہ آباء تو تمہارے ہی مگر تم کیا ہو؟

مگر میرا یہاں پہنچ جانا بڑی بات تھی وگرنہ زندگی تو مَیں گزار ہی چکی ہوں، اب عمر میں بچا کیا ہے، وہی چند سال جو اعضا کی شکستگی میں گزرتے ہیں۔

مَیں نے یکبارگی سوچا، سب کچھ چھوڑ چھاڑ ان مدرسوں سے وابستہ ہو جاؤں۔ قدم رکھ دوں ان قدموں پر جو میرے آباء و اجداد کے تھے اور اب عزیز الحسن صاحب جانے کتنے بڑے لوگوں کے قدم پر اپنے پاؤں رکھے جنّت تک جانے کا راستہ ہموار کر رہے ہیں۔ مَیں نے وہاں سے نکل کر اور پلٹ کر ان کی جانب دیکھا۔ مجھے اپنی دعاؤں میں شامل کر لیجئے کہ مَیں بہت کم ہمت اور دنیا پرست ہوں۔ آنسو یہاں بھی میری آنکھوں میں تھے مگر پلکوں تک محدود تھے۔ کہتے ہیں سب سے مشکل کام آنسوؤں کو آنکھوں سے نہ نکلنے دینا ہے یا امنڈے ہوئے آنسوؤں کو واپس آنکھوں میں لے جانا۔

میؔر نے کہا تھا۔

پاس ناموسِ عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

غازی پور کی سیاحت ختم ہونے کو تھی اگرچہ یہاں دیکھنے کو ابھی بہت کچھ تھا۔ مجھے امیر مسعود غازی کی قبر دیکھنی تھی جو آج بھی موجود ہے۔ اسے سلام کرنا تھا کہ اس نے اس شہر کی بنیاد انصاف پر رکھی تھی۔ شکوہ کرنا تھا کہ مجھے یہاں انصاف نہیں مل سکا۔ مگر پھر بھی شکریہ ادا کرنا تھا کہ اس خمیر سے میرے دادا، پردادا اٹھے۔ اسی زمین نے انہیں پالا اور اسی شہر نے انہیں بامِ عروج تک پہنچایا۔

اسی کی تاریخ میں ان کا نام سنہرا ہوا اور ان ہی کی نسل سے آج ہم غرور کے ساتھ زندہ ہیں اور یہیں کی مٹی نے ان گنج ہائے گرانمایہ کو ابد تک پناہ دی ہوئی ہے۔ مزار بے نام ونشان ضرور ہو گئے کہ وقت ایسی دنیاوی تباہی تو لے ہی آتا ہے وگرنہ یہاں کی خاک میں ان کی خاک تو شامل ہے ہی۔ مَیں نے ایک ہی فاتحہ میں سب کو تحفہ دینے کی کوشش کی۔

مجھے ایک بزرگ کے مزار پر بھی جانا تھا جن کا خطاب زبدۂ عباد وعرب اور نام حافظ حکیم حبیب اللہ مکی ہے۔ جن کا تعلق سرزمینِ مکہ سے تھا۔ آپ کے مورثِ اعلیٰ چار سو سال قبل ہندوستان آئے اور پھر غازی پور میں بھی قیام کیا۔ جن کے متعلق مشہور ہے کہ وہ معطر عربی لباس زیبِ تن کیے رہتے۔ عاشقانہ اور والہانہ انداز میں جھومتے چلے جاتے۔ ہر وقت سوزِ باطن میں ڈوبے ہوئے اور متحیر حال نظر آتے۔ عالمِ جذب میں عبرت ونصیحت کا دریا بہا دیتے۔ اپنے عہد وپیمان کا پاس رکھتے بلکہ ایفائے عہد آپ کا شعار بھی تھا۔

ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ متعدد بار لوگوں نے انہیں بیک وقت دو جگہ دیکھا۔ چنانچہ آپ کے انتقال کے بعد اسی دن انہیں تین مختلف جگہوں پر دیکھا گیا۔ کچھ لوگوں نے تو چشمِ دید شہر غازی پور کی سٹی مسجد میں نماز ادا کرتے بھی دیکھا۔ کچھ نے محلّہ نور الدین میں دیکھا۔ ان کا انتقال 6 ستمبر 1940ء کو ہوا۔ مجھے ان کے مزار دیکھنے کا شوق ان کی شخصیت کے کمالات کے باعث تو تھا ہی مگر یہ بھی کہ ان کے مزار پر جو کتبہ نصب ہے۔ میرے ابا نے قطعہ تاریخِ وفات نکالی ہے۔

یادگار زبدۂ عباد وعرب صاحب غازی پور

1940ء

محبّ حق رضی اللہ عنہ

1359ھ

اور ایک نظم بھی لکھی جو "کمالِ حسن" میں موجود ہے۔

چند شعر درج ہیں

حسنؔ حافظ حبیب اللہ مکّی — خضر صورت جواں سیرت معمّر
کبھی سالک کبھی مجذوب تھے وہ — بہر حالت امام نیک محضر

ہوئے بیمار تپ میں بعد سہ روز
نہ چھوڑا آپ نے تا زیست منبر
تھے عبداللہ بھی حاضرِ خدمت
نہیں آخر ہوئے افسوس جاں بر
ہے ہجرت جنت انوارِ رحمت
مسیحی قوت روحِ مظفر
1359ھ
1940ء

اس نظم کے سترہ اشعار ہیں اوران کے مزار پر تحریر ہیں۔ مَیں چاہتی تھی اپنی آنکھوں سے دیکھوں، نہ دیکھ سکی۔

گوجی تر کا کنیا پاٹ شالہ جہاں مَیں چند دن پڑھنے بھی گئی، سنا ہے اب گرلز کالج بن چکا ہے۔ وکٹوریہ اسکول جس کی بنیاد سر سیّد احمد خان نے ڈالی تھی۔ تحریکِ پاکستان کے دنوں میں ایک بار اس پر مسلم لیگ کا جھنڈا بھی لہرایا گیا تھا اور یہ کام میرے ابا کے ہاتھوں ہوا تھا۔ اور بہت سی جگہیں میرے ذہن میں تھیں۔ گنگا کا کنارا بھی جہاں میری ایک عزیزہ کا گھر تھا۔ وہاں مَیں اپنی کزن کے ساتھ گنگا کی مٹی بھی لائی تھی جس سے ہم نے چھوٹے موٹے کھلونے بنائے تھے۔ وہ کھلونے آج بھی میرے ذہن میں جوں کے توں موجود تھے۔ وہ ٹوٹے بھی نہیں، کبھی نہیں۔ مَیں نے ان کھلونوں کو بھی حسن منزل میں تلاش کیا تھا مگر وہ نہیں ملے، بالکل اسی طرح جیسے میری امّاں، میرے ابا، دادا اور دادی کی پر چھائیاں بھی مجھے نہیں ملیں۔

طاق میں بیٹھی گڑیا بھی نہیں ملی۔ میری اوّلین کتاب، کاپی اور پینسل بھی وہاں نہیں تھے۔ شاید ان سب نے مجھے ڈھونڈا ہوگا اور نہ ملنے پر وہ روٹھ کر کہیں چلے گئے۔ شاید وہاں جا کر وہ مجھے یاد کر رہے ہوں گے اور مَیں تو انہیں اپنی آنکھوں اور یادوں میں جگہ دیے بیٹھی ہی ہوں۔ ایک عمر سے۔

❑

میرے آباءواجداد کا گاؤں

اپنا آبائی گاؤں، مَیں اسے نہیں چھوڑ سکتی تھی جس کا نام پہتیا تھا۔ تاریخ میں جگہ جگہ اسے سرولی بھی کہا گیا ہے۔ شاید سرولی آم کا نام یہیں سے لیا گیا ہو۔ کہتے ہیں یہ بڑا سرسبز گاؤں تھا۔ نہریں بہتی تھیں۔ کھیت اور باغ کثیر تعداد میں تھے۔ یہاں شیخ صدیقی خاندان سب سے مشہور تھا۔ اسی خاندان سے میرا تعلق ہے جہاں مولوی صدیق کے دولائق فرزند حافظ قاری محمد علی جو اردو فارسی کے صاحبِ دیوان شاعر اور وکیل تھے، اتنے نامی گرامی وکیل کہ ہندوستان کے بڑے بڑے صاحبانِ علم ان کے حلقۂ احباب میں تھے۔ دینی وعصری دونوں تعلیم میں دستگاہ رکھتے تھے۔ سولہ سال کی عمر سے شاعری شروع کردی تھی۔ اردو کلام تو ضائع ہوگیا مگر فارسی کلام علی گڑھ سے 1931ء میں شائع ہوا۔ ''کلیاتِ قاری'' میں غازی پور کے ممتاز ادیبوں اور شاعروں کی وفات پر تاریخی قطعات موجود ہیں۔ انہوں نے شیخ الہند مولانا محمود الحسن پر جو نظم لکھی وہ معرکتہ الآرا ہے۔

اسی طرح مولوی عبدالصمد، سرسیّد احمد خان کے دوستوں میں تھے۔ مسلم یونیورسٹی کو چندہ بھیجنے والوں کی فہرست میں اوّل تھے۔ نامور وکیل، مختلف انجمنوں اور بورڈ کے جج بھی تھے۔ حکومتِ برطانیہ نے انہیں خان بہادر کا خطاب بھی عطا کیا تھا مگر انہوں نے جذبۂ حب الوطنی کے سبب اعزاز قبول کرنے سے انکار کردیا۔ عبدالصمد صاحب شاعر بھی تھے، اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے شاعر مگر ان کا کلام محفوظ نہیں رہا۔ تاہم ان کی قادرالکلامی اس لیے مسلّم ہے کہ وہ عبدالعلیم آسی غازی

پوری سے شرفِ تلمذ رکھتے تھے۔ جن کے بارے میں غالب نے کہا تھا: ''اللہ اللہ اتنے قادرالکلام شاعر آج بھی ہندوستان میں ہیں۔'' ان کا کلام وہ خود لے کر غالب کے پاس دہلی گئے تھے۔

سر سیّد احمد خان نے صمد منزل میں آ کر ان سے ملاقات کی اور غازی پور سے جانے کے بعد بھی خط و کتابت کرتے رہے۔ ان کا کتب خانہ مولانا آزاد لائبریری میں منتقل کر دیا گیا۔

ان دونوں بھائیوں نے غازی پور میں آمنے سامنے گھر بنایا۔ مگر محمد علی نے حلیمہ منزل اور محمد علی منزل پہتیا میں بھی بنائی جو فنِ تعمیر کا بھی اعلیٰ نمونہ تھی۔

مجھے یہ دونوں گھر دیکھنے تھے کہ اگر ہم ہجرت نہ کرتے تو اس کے وارث ہم پانچ بہن بھائی ہی ہوتے۔

پہتیا کے صدیقی خاندان میں ڈاکٹر عبدالعلیم صدیقی بھی تھے جو بعد میں علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے۔ وہ ہمارے چچا تھے، ان کا گھر بھی پہتیا میں موجود ہے۔ فاطمہ منزل بھی دیکھنی تھی جو جنید عالم کی ملکیت تھی اور جو میرے پھوپھا تھے۔ وہیں کہیں احراری خاندان بھی رہتا تھا جو سب کا سب پاکستان ہجرت کر گیا۔ ان میں وحید اللہ احراری سب سے مشہور شخصیت تھی۔ انگریز اور انگریزی حکومت سے سخت متنفر تھے۔ سرکاری اسکول میں ٹیچر تھے۔ انگریزوں سے لڑتے، جیل جاتے رہے۔ آزادی کی کوئی ایسی تحریک نہیں تھی جس میں ان کا کوئی حصہ نہ ہو۔ سول نافرمانی میں پیش پیش رہے۔ پنڈت نہرو کے ساتھ جیل کاٹی۔ خلافت کمیٹی کے سیکریٹری رہے۔ ان کی جواں مردی، حُب الوطنی اور انگریز دشمنی کے کئی قصے مجھے ازبر ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس دور کے بہادر آدمی ہمارے خاندان کے ہی ایک اہم فرد تھے۔ اچھے آرٹسٹ تھے۔ مسلم یونیورسٹی کی پکچر گیلری کے محافظ بھی تھے۔ انہوں نے سر سیّد کی تصویر بھی بنائی تھی۔ علی گڑھ اور غازی پور، دونوں شہروں میں مسلم مسافر خانے کے بانی وہی تھے۔ سرکاری ملازمت سے فراغت کے بعد انہیں پنشن صرف اس لیے نہیں ملی کہ پنشن بک کسی نے دشمنی میں غائب کر دی تھی۔ پروانہیں کی، جیتے جی پنشن سے محروم رہے۔

اندرا گاندھی نے انہیں ''تامر پتر'' قومی خدمات کے صلے میں دیا تھا۔ وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ صاحب تخلص کرتے۔ اکبر کے رنگ میں اشعار کہتے۔ شیخ الہند حضرت مولانا سیّد حسین احمد

مدنی کے مریدوں اور جاں نثاروں میں تھے۔ ہمارے دادا ہوتے تھے۔ پہتیا جاتے ہوئے ان کا بھی خیال آنا ضروری تھا کہ کراچی میں افضال بھائی، ان کے پوتے، موجود ہیں جو ضرور مجھ سے پوچھتے: "پہتیا میں تم نے میرے دادا کو یاد کیا تھا یا نہیں؟" ہاں وہ مجھے یاد تھے۔

پہتیا میں شاید مَیں نے کبھی قدم نہیں رکھا ہوگا۔ یا شاید اماں کی گود میں کبھی گئی ہوں گی۔ وہاں کی زمین میری مانوس نہیں تھی مگر مَیں اسی زمین سے اٹھے لوگوں کی اولادوں میں سے ایک تو ہوں۔ محبت تو مجھے اس گاؤں سے بھی تھی جسے میری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

ہم جس راستے سے پہتیا میں داخل ہوئے شاید وہ گاؤں میں داخل ہونے والا واحد راستہ رہا ہو یا اور بھی راستے رہے ہوں گے۔ مجھے اس کے محل وقوع سے کوئی آگاہی نہیں تھی۔ داخل ہوتے ہی ایک مزار نظر آیا جہاں ڈھیروں ہندو زائرین اپنی منت پوری ہونے کے انتظار میں کُھلے آسمان تلے بیٹھے تھے۔ عقیدت بھی کیا کیا کرشمے دکھاتی ہے۔ ان زائرین پر نہ گرمی کی شدت کا اثر تھا نہ بچوں کے بچپن کا۔ وہ بس دعائیں مانگنے میں مشغول تھے۔

کچھ لوگوں نے ہماری آمد پر دوڑ کر استقبال کیا، ان میں بچے بھی تھے اور بڑے بھی۔ لگتا تھا بہت دنوں بعد گاڑی اس ویران گاؤں میں آئی تھی۔ یہ جان کر کہ یہ گاؤں ہمارے ہی آباءواجداد سے آباد تھا اور ان کے انتقال اور پھر ہجرت کے بعد مکمل طور پر اُجڑ گیا ہے۔ وہ خوشی خوشی ہمیں ہمارا ہی گھر دکھا رہے تھے جس کے کچھ ستون، کچھ محرابیں، کچھ چھتیں سلامت تھیں۔ قیمتی پتھر عمارت سے نکال لیے گئے تھے۔ بارش، موسم کی سختی، بے توجہی اور اپنے مالکان کی جدائی کے باعث اب وہ پرانی بوسیدہ عمارتوں میں شمار ہو رہے تھے۔ کون سا گھر کہاں سے شروع ہوتا تھا اور کہاں پر ختم، یہ جاننا مشکل تھا کہ ہر حویلی طویل رقبے پر مشتمل تھی۔

مگر ایک صاحب ایک کھنڈر نما حویلی میں دھوتی بنیائن میں ملبوس کرسی پر بیٹھے خود کسی آثارِ قدیمہ سے کم نہیں لگ رہے تھے، روانی کے ساتھ گھر کی کہانی بیان کر رہے تھے۔ حلیمہ منزل کی کہانی، محمد علی منزل کی کہانی یعنی ہمارے دادا اور دادی کے گھروں کی کہانی، بڑے دروازے والا محل جہاں ہاتھی بندھے ہوتے تھے۔ ان کے منہ سے اپنے آباءواجداد کے گھر کی کہانی سن کر اچھا لگ رہا تھا۔ ان لوگوں کو گئے صدی بیت گئی مگر کہانی دلوں میں زندہ ہے۔ وہ سب کو جانتے تھے اور مجھے بھی میری

ولدیت کے حوالے سے فوراً ہی پہچان گئے۔ شکایت بھی کر رہے تھے، آپ سب یہاں سے چلے گئے اور ہمیں تنہا چھوڑ گئے۔ اب ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ جی چاہا کہوں، یہ ساری زمینیں ہم بیچ کر تو نہیں گئے تھے۔ وہ سارے پھل دار باغ کہاں گئے؟ فصلیں اگاتی زمین بنجر کیوں بنادی؟ محنت سے روزی آتی ہے۔ خالی مکان اور تباہ ہوتے ہوئے باغ، آپ نے انہیں یہ تنہائی اور اذیت کیوں دی؟ ہم تھے تو یہ آباد اور سرسبز کیوں تھے، آپ ہیں تو یہ ویران کیوں ہیں؟ مگر مَیں چپ رہی۔ وہ میری سوچ شاید جان چکے تھے۔ اپنی کوتاہی سے آگاہی تو سب کو ہی ہوتی ہے ہاں اعتراف البتہ مشکل ہوتا ہے۔

مَیں نے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے یہ سوال ضرور کیا کہ آپ کے بچے کہاں ہیں؟ اسی لمحے کھنڈر کے ستون کی آڑ سے برآمد ہوتی ہوئی ایک خاتون نظر آئیں جو ملگجی سی ساڑھی میں ملبوس تھیں۔ ساڑھی کا پلو دائیں کندھے سے آگے کی طرف ڈالا ہوا تھا۔ اس طرح ساڑھی پہنے ہم نے اپنے خاندان کی بچی کھچی بوڑھی عورتوں کو دیکھا تھا۔ یہ پوربی اسٹائل تھا اور پاکستان میں پارسی عورتوں نے یہ اسٹائل اپنایا ہوا ہے۔ نہیں معلوم اس کے موجد پورب سے تعلق رکھنے والے ہیں یا پارسی قبیلہ سے۔

وہ میری بیوی ہے۔ انہوں نے اسی ہموار لہجے میں تعارف کرایا جس لہجے میں وہ اب تک بول رہے تھے۔

اور بچے؟ میرا سوال اب بھی بچوں تک ہی محدود تھا۔

انہوں نے آواز دے کر چار بیٹوں کو چشمِ زدن میں بلوالیا۔ ان کی دھیمی آواز کھنڈر میں گونج بن کر ابھری۔

چار جوان چاق و چوبند بیٹے سامنے ترتیب وار کھڑے تھے۔ کہنے لگے، نام نہیں پوچھیں گی؟ مَیں نے بددلی سے ہاں میں گردن ہلائی، اور کہا بھی، جی ضرور بتائیں۔ یہ بددلی یوں تھی کہ چار جوان بیٹے تو ماں باپ کی غربت کو آن کی آن میں دور کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر کرنا ہی نہ چاہیں تو کون ان سے کرا سکتا ہے؟

وہ بشاشت سے تعارف کرا رہے تھے۔ یہ عبدالعظیم ہیں، یہ عبدالعلیم، یہ ابوالحسن اور یہ حسن

عبداللہ۔ سب سے چھوٹے بیٹے حسن عبداللہ پر نظریں جم کر رہ گئیں۔ یہ صاحب میرے ابا کے ہم نام تھے۔ دوسرے میرے دادا، تیسرے چچا اور چوتھے ایک اور دادا کے ہم نام تھے۔

مَیں نے تعجب، خفگی اور حیرت سب کچھ اپنے لہجے میں سمیٹی اور گویا ہوئی۔

یہ آپ نے کیا کیا ہے؟ میرے ابا، دادا کے نام کیوں رکھے؟

اطمینان سے بولے، یہ لوگ بڑے آدمی تھے۔ اس گاؤں کے نامی گرامی، بس ان کی یاد میں یہ نام رکھ لیے ہیں۔

غصہ تو سخت تھا۔ دل ہی دل میں یہ کہہ کر رہ گئی کہ نام کی لاج تو رکھ لی ہوتی۔ ان جیسا بناتے بھی تو۔ وہ سب تعلیم سے عاری، گاؤں میں گھوم پھر کر زندگی گزار رہے تھے۔ شکوہ یہ تھا کہ سب بڑے لوگ چھوڑ کر پاکستان یا قبرستان چلے گئے، ان کا خیال قطعاً نہیں کیا۔ جانے دل میں وہ کتنی بار اُن کی روحوں سے یہ شکوہ کرتے ہوں گے؟

مگر مَیں نے پھر اپنے باغی خیالات کو تھپکی دی۔ زندگی میں پہلی بار ان سے ملے ہیں اب دوسری بار کی کہاں گنجائش، خوامخواہ غصہ کر کے کیا کریں گے۔ نہ وہ سب اپنا نام بدل لیں گے نہ کسی کام پر جائیں گے۔ تو پھر مجھے ان کی معصومیت پر پیار اور بے چارگی پر رحم آ گیا۔ جیب میں کچھ رقم ڈالنے کے سوا اور مَیں ان کے لیے کیا کر سکتی تھی؟ بلکہ ایک طرح سے مَیں ان کی مشکور بھی تھی کہ انہوں نے میری حویلیوں کی قطار در قطار حدود بتا دی تھیں۔

یکا یک مجھے ایک کنواں یاد آ گیا جو ہمارے آباء و اجداد نے کئی سو سال پہلے بنایا تھا اور سو برس بعد میرے ابا نے اس پر ایک نظم بھی کہی تھی۔ ابا کے دادا اس کنویں کا خیال یوں رکھا کرتے تھے جیسے یہ خاندان کا کوئی فرد ہو، یتیم ہو گیا ہو اور مدد کا طالب ہو۔ یہ کنواں ''پیرِ علی'' تھا۔ ابا کے دادا محمد علی تھے، بس ان کے ہی نام سے منسوب تھا۔

کھنڈر والے ان صاحب سے مَیں نے اس کنویں کے بارے میں پوچھا۔ اب یہ ان کا امتحان تھا کہ وہ ہمارے ہی خاندان کے فرد ہیں یا نہیں۔ دیکھتے ہیں وہ کیا جواب دیتے ہیں؟

سوچے بغیر جھٹ بولے، ہاں ہے نا۔ جاؤ حسن عبداللہ انہیں وہ کنواں دکھا دو۔

مَیں حیرت میں پڑ گئی۔ مگر مَیں کیسے یقین کر لوں کہ وہ پیرِ علی ہی ہے......؟

کہنے لگے، آپ کے دادا کے نام کی تختی اس پر لگی ہے۔ ٹھہرے لہجے میں انہوں نے جواب دیا۔

اونچے نیچے جھاڑیوں والے راستے سے دوڑتی بھاگتی اس کنویں کی جانب رواں دواں تھی جو نعمتِ غیر مترقبہ کی طرح مجھے مل گیا تھا۔ حافظہ یوں ساتھ نہ دیتا تو ایک نظم کے حوالے سے کنواں بھلا مجھے کیسے مل پاتا؟

حَسن عبداللہ نے مجھے اس کنویں تک پہنچا دیا جس کی منڈیر سلامت تھی اور اس میں ٹنوں لوہے کی گراری آج بھی نصب ہے۔ مجھے حیرت ہوئی، کیا یہاں کوئی ہیرو نچی نہیں؟ یا وہ اتنا بے وقوف ہے کہ آج تک اسے کھود کر نہیں نکال پایا۔ یا یہ کہ یہاں لوہے کی کوئی وقعت ہی نہیں کہ اس کی خرید وفروخت ہو سکے اور یا...... کہ اب میں نے ٹھہر کر آہستگی سے سوچا۔

یہاں کے لوگ اب بھی اتنے شائستہ ہیں کہ یادگاروں کو اجاڑا یا لوٹا نہیں کرتے؟ اب اگر یہی آخری خیال درست تسلیم کر لیا جائے تو کیا حرج ہے؟ ہاں کوئی حرج نہیں ہے۔ دل نے جواب دے دیا۔

اب مجھے نام کی تختی ڈھونڈنی تھی جو ذرا سی جھاڑی ہٹانے پر نظر آ گئی۔ پتھر کی بڑی سی سل ایک ستون پر چپکی ہوئی تھی جس پر ''پیر علی'' نمایاں حروف میں تحریر تھا۔

اس کنویں کے بانی آباء واجداد میں سے کوئی صاحب، جن کا نام سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچا تھا، کوئی رحم اللہ صاحب تھے۔ مجذوب، عشقِ رسول اور عشقِ خدا میں ڈوبے ہوئے۔ انہوں نے کنواں بنا کر پیاسوں کو پانی مہیا کر کے جنّت کا راستہ ڈھونڈ لیا تھا۔ جانے کتنی صدی بعد جسے حافظ محمد علی نے اپنا لیا۔ مرمت کراتے، میٹھے پانی سے سارے گاؤں کی ضروریات مفت فراہم کرتے۔ ایک دن وہ بھی جنّت کے مسافر ہو گئے۔ میرے دادا نے اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلنا بھی ضروری سمجھا اور یہ بھی ضروری جانا کہ اس پر اپنے نام کی تختی پرانی کہانی کے ساتھ لگا دی۔ یوں یہ آئندہ نسل تک کے لیے قابلِ پہچان بن گیا۔

ہمارے ابا گاؤں سے شہر غازی پور اور پھر علی گڑھ جا بسے تھے اور تو کچھ نہ کر سکے، ایک بڑا کام یہ کر گئے کہ اس کنویں کی شان اور اپنے دادا پردادا کی وراثت پر نظم لکھ گئے۔ اگر ابا اس کنویں پر نظم نہ لکھتے، وہ نظم مجھ تک نہ پہنچتی تو میں اس کنویں تک کیسے آتی؟

تختی لگنے کے سو سال بعد مَیں نے وہ کنواں دیکھا۔ جھانک کر دیکھا، کنویں میں جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اور پانی شاید اسی وقت خشک ہو گیا ہوگا جب اس شجرۂ نسب کا آخری فرد یہ گاؤں چھوڑ کر چلا گیا ہوگا۔ کہتے ہیں کنویں میں جھانکیں تو پانی آئینہ بن جاتا ہے، شکل نظر آتی ہے مگر مجھے میری اپنی شکل نہیں اَن دیکھے اُن بزرگوں کی شکل نظر آ رہی تھی جن کے خدوخال سے بھی مَیں واقف نہیں تھی۔ جی چاہا کاش اس میں آج بھی پانی ہوتا، مَیں ڈول ڈال کر پانی نکالتی، پی لیتی۔ اس میٹھے کنویں کا پانی میرے بھی جسم میں چلا جاتا، ایسے لگتا کہ شجرۂ نسب سے جُڑے تمام بزرگوں کا جھوٹا مجھ تک بھی پہنچ گیا۔ مگر وہ تو خشک تھا۔ اسی شجرۂ نسب کی طرح جواب نئی نسل کے لیے کسی رڈی پیپر سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ خشک اور کاغذ پر لکھی لکیروں کے سوا اور کیا ہے؟

مَیں کنویں کی منڈیر پر بیٹھ گئی۔ اس کے ستون کو ہاتھ لگایا، اس تختی پر ہاتھ پھیرا۔ جانے تختی بنانے والا کون تھا۔ تختی پر کھدائی کرنے والا کون تھا۔ یہ پتھر کہاں سے لایا گیا تھا اور اس کی تقدیر میں یہ کنواں ہی کیوں تھا؟ مجھے ایسے ہی اوٹ پٹانگ خیالات آتے رہتے ہیں، وہاں بھی بیٹھی یہی سوچتی رہی۔

آخیر میں اپنے موبائل سے کنویں کی تصویر بنائی اور خود بھی تختی کے ساتھ چپک کر کھڑی ہو گئی۔ اس تک پہنچ جانا ایک معجزہ تھا جو میری سوچ سے بھی باہر تھا۔ بزرگوں کے لیے یہاں کھڑے کھڑے دعائے مغفرت کی کہ قبرستان کا وجود ہی نہیں تھا بس اسی کو یادگار جانا۔ دیر سے آنے پر ان کی روحوں سے معذرت کی۔ چاہا کہ جھانک کر ایک بار پھر دیکھوں۔ اب اس میں پانی تو نہیں اُبل پڑا ہے؟ دو بوند اپنی آنکھوں سے بھی ٹپکا دوں۔ سوچ کے ساتھ ہی آنکھیں بھر آئیں۔ اور مَیں نے سچ مچ اپنے آنسو اس خشک کنویں کی نذر کر دیے۔ حفاظت سے رکھنا، اپنی یہ سوغات بخشنے بہت دور سے آئی ہوں۔ پاسپورٹ ویزا کے ساتھ آئی ہوں، گواہ رہنا۔

کنواں تو فیض کے لیے بنایا جاتا ہے۔ بنانے والے کو فیض جاری ہو گیا ہوگا۔ بعد میں اس یادگار کی حفاظت کرنے والے بھی اللہ کے فیض سے فیض یاب ہوئے ہوں گے۔ مَیں پانچویں یا چھٹی نسل کی ایک فرد تھی، ہاتھ اٹھا کر اللہ سے دعا کی، ''اللہ تعالیٰ میرے نیک آباء و اجداد کے کاموں کی برکت سے میری بھی جھولی بھر دے۔'' شاید دعا فوراً ہی آسمان تک پہنچ چکی تھی کہ

جیسے میرے دل میں سرور کی سی کیفیت پیدا ہوئی۔ مَیں نے غیب کی اس کیفیت کو دعا کی بار آوری ہی سمجھا۔

آگے بڑھی تو "فاطمہ منزل" نظر آئی۔ اس پر کہیں نہیں لکھا تھا کہ یہ فاطمہ منزل ہے۔ ان ساتھیوں نے بتایا جو قافلے کی صورت میں ہم سے آملے تھے۔ جن میں مسلمان اور ہندو دونوں تھے۔ یہ ٹھیک ٹھاک بنی ہوئی عمارت تھی۔ مَیں اس کے سامنے رک گئی۔

یہ کس کا گھر ہے؟

سامنے کھڑے ایک صاحب نے جو صرف دھوتی میں ملبوس تھے، جواب دیا۔ "یہ ہمارا گھر ہے۔"

میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ پہلے کس کا گھر تھا؟

وہ صاحب اسی اطمینان سے بولے۔ یہ فاطمہ منزل ہے، اس کے مالک ہیرے جواہر کے تاجر تھے، سو سال پہلے یہاں سے چلے گئے۔

میرے ذہن نے کام کرنا شروع کر دیا۔ اب پھر ایک جذباتی مقام آ چکا تھا۔

مَیں نے باہر بنے چبوترے پر بیٹھتے ہوئے اطمینان سے کہا۔ یہ میری پھوپھی کا گھر ہے۔ ان کا نام فاطمہ تھا۔ وہ اپنے نام جتنی ہی خوب صورت تھیں۔ پاکستان بلکہ کراچی ہی میں رہتی تھیں۔ میرے پھوپھا ہیرے جواہر کے نہیں، عطر کے تاجر تھے جن کا نام جنید عالم تھا۔ اب بھی دنیا کے ڈھیر سارے ملکوں میں ان کا عطر کا کاروبار ہے۔ اب نہ جنید عالم ہیں نہ فاطمہ بیگم۔ یہ مکان بھی دوسروں کے حصے میں آ گیا۔ مگر اچھی حالت میں ہے۔

مَیں نے اجازت چاہی، کیا مَیں اندر جا سکتی ہوں؟

وہ میرے آگے آگے ہو لیے۔ آپ ہی کا گھر ہے، ضرور آیئے۔ انہوں نے اپنا گھر کہہ کر تعارف کرایا تھا اور اب اسے ہماری ملکیت تسلیم کرنے میں انہیں کوئی عار نہیں تھا۔ بھولے لوگ تھے۔

مَیں نے کہا بھی، کیا یہ اب بھی فاطمہ منزل ہے؟ کہنے لگے ہاں نام اب بھی یہی ہے۔ تختی کہیں بھی لگی ہوئی نہیں تھی۔

آپ نے گھر کا نام کیوں تبدیل نہیں کیا؟

جواب ملا، فاطمہ نام مبارک ہے بس اسی لیے۔

آپ کو یہ معلوم ہے کہ فاطمہ نام مبارک ہے؟

انہیں ہماری اسلامی تاریخ کا علم تھا۔

صدر دروازے پر تین بتوں کی تصویر بھی لگی تھی۔ دکھا کر کہنے لگے، ہم نے اسے بھی یہاں لگا دیا ہے کہ دور سے پتا چلے کہ ہم یہاں رہتے ہیں۔اس وہم میں ایک خاص معنی پوشیدہ تھا۔

کوئی مضائقہ نہیں۔ ہم نے نہایت کڑوی گولی نگلتے ہوئے جواب دیا۔ وہ صاحب پھر بولے، اوپر بھی تو دیکھئے۔

اوپر کیا ہے؟ میں نے گردن پوری کی پوری پیچھے کر دی تب جا کر پتھر کی ایک چھوٹی سی تختی دیوار میں چنی ہوئی نظر آئی۔اتنے اوپر سے میری چشمہ زدہ آنکھیں کچھ نہیں دیکھ پا رہی تھیں۔

اس تختی پر آیت الکرسی تحریر ہے۔ہم نے اسے بھی رہنے دیا ہے کہ یہ مبارک آیت ہے۔

نئے ہندو مالک کی گفتگو میں تعصب کی ذرا بھی بو نہیں تھی۔میں نے انہیں احترام کی نظر سے دیکھا۔

وہ اور بھی مہربانی پر تُلے ہوئے تھے۔آپا جی کچھ کھا پی کر جائیں۔آپ اتنے دنوں بعد اپنی پھوپھی کے گھر آئی ہیں۔ہمیں بھی اپنا بھائی ہی سمجھیں۔

ان کے اس خلوص پر کون قربان نہیں ہو جاتا۔مگر انہیں کیسے بتاتے کہ ہماری پھوپھی کی اولاد ہم سے قریب ہمارے ہی شہر میں رہتی ہیں۔نہ ہم ان کے گھر جاتے ہیں نہ وہ ہم سے ملنے آتے ہیں۔یہ نہیں کہ محبت ختم ہو گئی ہے۔بس ترجیح کا فقدان ہے۔

بہر حال یہ کیفیت یا حقیقت بتانے والی نہیں تھی، صرف محسوس کر کے شرمندہ ہو جانے والی تھی۔سو ہم شرمندہ ہوئے بھی۔ان کے خلوص کا شکریہ ادا کیا۔وقت کی تنگی بتائی اور گاڑی میں بیٹھ کر اپنے چچا ڈاکٹر عبدالعلیم کے گھر کے برابر والی سڑک پر ہو لیے کہ ان کا مکان حکومتِ ہند کے حصے میں آ چکا ہے۔جبکہ ڈاکٹر صاحب کی فیملی علی گڑھ منتقل ہو گئی ہے۔ پاکستان نہیں گئی۔گھر کے قبضے کی قانونی حقیقت جان کر بھی کیا کرتی؟ ہاں ڈاکٹر عبدالعلیم جو مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر

کے عہدے پر فائز رہ چکے تھے اور یونیورسٹی کے قبرستان میں ہم ان سے مل کر آئے تھے کہ قبر نہ صرف نمایاں جگہ پر تھی بلکہ نام کی تختی بھی واضح تھی۔ ہم نے تو آلِ احمد سرور کی قبر بھی اچانک پالی تھی اور معین احسن جذبی کے ساتھ جناب ظہیر الدین علوی اور ممتاز جہاں کی قبریں بھی بلا ڈھونڈے مل گئی تھیں، بس نہیں مل رہی تھی تو اپنے ابا کی قبر تھی جس کی چاہ میں یہ سارا سفر طے کیا تھا۔

پہتیا کی وہ مسجد بھی دیکھی جواب بھی بے اذان نہیں ہے۔ واپسی کے سفر میں میرا ذہن صدیوں پرانے پہتیا میں کہیں الجھا ہوا تھا۔ وہ سارے خوب صورت لوگ جو میرے شجرے سے جُڑے ہوئے تھے، جن کے خدوخال سے بھی مَیں واقف نہیں تھی، چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ اَن دیکھی ساری حویلیاں ساز و سامان سے سجی اور دولت کے انبار سے اٹی میری نظروں میں پھر رہی تھیں۔ آم امرود کے کھیت، سنگھاڑے کے ٹوکرے کے ٹوکرے۔ جامن اور دیگر سبزیاں اور پھل، درخت اور پودوں میں اٹکے دیکھ رہی تھی۔ گیہوں، چنا، جوار اور باجرے کے اونچے اونچے مٹی کے لمبوترے برتن، سب میری نظروں میں یوں تھے جیسے مَیں ان گھروں میں سارے موسم گزار چکی تھی۔ مجھے سردی بھی محسوس ہوئی، گرمی بھی لگی۔ خزاں کی افسردگی بھی نظر آئی اور بھری بہار کے مزے بھی لیے۔ ہلکی ہلکی پھوار اور دھواں دھار بارش کے مزے بھی لے لیے۔ گاڑی کا سفر واپسی کا سفر تھا۔ ساتھیوں نے کہا، آج گرمی کچھ زیادہ ہے۔ تب مَیں اصلی دنیا میں پلٹ آئی، ہاں ٹمپریچر 48° سے ہر صورت زیادہ تھا۔

مگر میرے جسم کے اندر کا موسم کیسا تھا؟ مَیں اسے کوئی نام نہیں دے پائی تھی کہ ان چاروں موسموں کے نام کے علاوہ مجھے پانچویں موسم کے نام کا کوئی پتا نہیں تھا۔ مگر اسی لمحے میرے وجود نے چیخ چیخ کر کہا، ہاں مجھے اس موسم کا نام معلوم ہے، یہ درد کا موسم ہے۔

یقین جانیے میرا سارا جسم ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔

❑

میری امّاں کے بچپن کا آنگن

واپسی کے راستے میں میرا ننھیال پڑتا تھا۔ میرے ماموں کی بیٹی جو سارے سفر میں میری گائیڈ اور میزبان بھی تھی، وہ گاؤں اس کا بھی گاؤں تھا جہاں وہ پیدا ہوئی، پلی بڑھی اور بیاہ کر دوسرے شہر چلی گئی۔ میرے ساتھ شوق لیے وہ اپنے میکے جا رہی تھی اور مَیں راستے بھر سوچ رہی تھی کہ مَیں اپنی اماں کے میکے جا رہی ہوں۔ یہ گاؤں محمد آباد، یوسف پور یا سلیم پور کہلاتا ہے۔ یہاں انصاری اور ہاشمی خاندان رہتے تھے۔ اماں ہاشمی خاندان کی سیّدزادی تھیں۔ نانا نامی گرامی حکیم تھے اور گاؤں میں بہت نیک نام تھے۔ اماں اپنے دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھیں۔ ان کے بھائی زندگی بھر وراثت میں سے ان کا حصہ محفوظ رکھتے اور موقع ملتے ہی ان تک پہنچانے کی کوشش کرتے مگر اماں اپنے حصے کی خواہاں کبھی نہیں رہیں۔ لینے سے پہلے بانٹ دیا کرتی تھیں۔ اپنے اسی گاؤں کے ضرورت مندوں میں۔ مَیں اسی گاؤں جا رہی تھی جہاں میری کوئی یادیں نہیں تھیں مگر سنی سنائی دنیا میں جانا کسے اچھا نہیں لگتا۔ یہ گاؤں میرے نانا نانی کا گاؤں تھا جہاں میری پرنانی بھی رہتی تھیں جو ایک بیٹی پیدا کرنے کے بعد بیوہ ہو گئی تھیں پھر ساری عمر بیٹی کے ساتھ رہتی رہیں۔ مجھے ان سے نہیں، ان کی قبروں سے ملنا تھا۔ یہ عجیب بات تھی کہ مَیں اتنے سالوں بعد اس سفر پر نکلی تھی کہ جب سب رشتے دنیا سے جا چکے تھے اور تمام گھر اپنا نقشہ گنوا بیٹھے تھے۔ بچپن کی موہوم سی ایک یاد ضرور تھی مگر وقت گزرنے کے بعد تمام یاد بغیر کسی نقشے کے مٹ چکی تھی۔ ویسا گھر نہیں تھا۔ مکین بھی بدل گئے تھے۔ آنگن سنسنان، دالان غائب اور کمرے آدھے رہ گئے تھے۔

گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کا سفر تھا۔ گرمی اپنے زوروں پر تھی اور مَیں بے یقینی کی صورت میں اپنی نشست پر بیٹھی باہر کی دنیا دیکھ رہی تھی۔ کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ بچپن کا چھوڑا ہوا یہ راستہ دوبارہ کبھی قدموں تلے آئے گا۔ اماں کا یہ گاؤں میرے ذہن کے نقشے میں بہت دھندلا سا موجود تھا۔ نانی کی شکل یاد نہیں تھی مگر ہاں ایک ہیولا تھا جو نانی کا تھا۔ ہم جب کبھی غازی پور سے سلیم پور جاتے، نانی ہمارے لیے سراپا انتظار ملتیں۔ ہمیں گاؤں کی سوغات ملتی۔ گرمی کے دنوں میں ستو پینے کو ملتے اور سردیوں میں اصلی گھی کے لڈو جو ہم بہت شوق سے کھاتے۔ ایک دم سے ایک بھولا ہوا مزہ منہ میں امنڈ آیا۔ نانی دال چاول میں ایک چمچہ گھر کے اصلی گھی کا ڈال دیا کرتیں، کھانے کا مزہ دوبالا ہو جاتا۔ کچے گھی کا کھانے میں ایسا استعمال پھر کبھی نہیں کیا لہٰذا، ایسا مزہ نانی کے گھر کے سوا اور کہیں نہیں ملتا۔ شام ہوتے ہی بھاڑ سے بھنا ہوا چنا آ جاتا۔ گرم گرم چنے کا مزہ بھی بس نانی کے گھر کا اور ہی تھا۔

راستہ طے ہوتا جا رہا تھا۔ ہم سلیم پور کے قریب ہی تھے کہ مجھے یاد آیا، میرے کان اور ناک نانی کے گھر ہی چھیدے گئے تھے۔ پہلی بار کانوں میں چاندی کی بالی نانی نے اپنے ہاتھوں سے پہنائی تھی۔ مجھے یہ بھی بھولی ہوئی بات یاد آئی کہ ناک کا دھاگا جب کاٹا گیا تھا تب نیم کے پتوں والی باریک سی سلائی توڑ کر ناک کے سوراخ میں ڈال دی گئی تھی۔ شاید حکمت یہ بتائی گئی تھی کہ اس سے چھید پکتا نہیں، اور ایسا ہی ہوا تھا۔ مدتوں ناک میں لونگ پہنی پھر یکا یک نکال لی اور سوراخ بند کر دیا۔ مَیں نے ناک کے سوراخ پر ہاتھ پھیرا، برسوں کی یہ پرانی یاد پھر سے ذہن میں تازہ تھی۔

نانا کو ہم نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ ہماری پیدائش سے پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا مگر ہاں بوڑھی سی پرنانی ہمیں نانی سے بھی زیادہ واضح طور پر یاد تھیں۔ اس لیے بھی کہ نانی کسی حجِ اکبر والے دن دنیا سے چلی گئی تھیں مگر پرنانی ہمارے پاکستان آنے تک زندہ تھیں۔ مجھے اتنا ضرور یاد تھا جب اماں پاکستان جانے سے قبل ان سے ملنے گئیں تھیں تب وہ اتنا روئی تھیں کہ ہم حیرت سے ان کو تک رہے تھے اور یہ نہیں جان پائے تھے کہ اتنا رونے سے ان کا کیا مطلب تھا۔ آج مطلب واضح تھا۔ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کی اکلوتی بیٹی کو بے انتہا چاہتی تھیں اور کہتی جاتیں، جاؤ خوش رہو مگر اب مَیں تم لوگوں سے جیتے جی نہیں مل پاؤں گی۔ واقعی پھر ہم بھی ان سے جیتے جی کبھی نہیں مل پائے۔

پاکستان میں ہمیں ان کے گزر جانے کی اطلاع ملی۔ اور اماں اتنا ہی روئی تھیں جتنا کہ نانی کے مرنے پر روئی تھیں۔ شاید اس سے بھی زیادہ کہ اماں کو بخار نے بھی آ لیا تھا اور اماں کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھی گئی تھیں۔

ہم نے ننھیال میں دو ماموں، دو ممانیاں بھی یادگار چھوڑی تھیں اور ان کے بچے بھی۔ دونوں ماموؤں کی ایک ایک لڑکی ہمارے برابر تھی جو ہماری بہنوں کے علاوہ سہیلیاں بھی تھیں۔ وہ سب وہیں رہ گئے تھے۔ ہم ماموں ممانی کے انتقال کی خبریں آگے پیچھے سنتے رہے۔ یوں چار بھائیوں پر مشتمل ہمارا ننھیال وہاں باقی رہ گیا جن کی شکلیں بھی ہمیں یاد نہیں تھیں۔

سلیم پور میں قدم رکھتے ہوئے اماں کی یاد نے ایسا تڑپایا کہ بے اختیار آنسو چھلکنے لگے۔ اسی آنگن میں کھیلے اماں کا بچپن گزرا تھا۔ وہ آنگن سمٹ کر اب چھوٹا سا رہ گیا تھا۔ تمام عمارت گر چکی تھی۔ مکین جا چکے تھے۔ ایک بھائی اپنی بیوی اور ایک بیٹی کے ساتھ رہ رہا تھا۔ وہ یوں ٹوٹ کر ملا کہ خون کی گردش تیز ہوگئی۔ ایسے سگے رشتے سرحد کے دونوں پار بٹ گئے تھے۔ ہندوستان کی ساری گرمی سمٹ کر سلیم پور میں آ گئی تھی۔ بجلی گھنٹوں سے غائب تھی۔ گرمی کا احساس سب سے زیادہ یہاں آ کر ہوا۔ برف کا پانی پلایا گیا مگر ٹھنڈک پھر بھی پاس نہیں پھٹکی۔

ہمارے پاس چند گھنٹے تھے جس کے بعد ہمیں اعظم گڑھ لوٹ جانا تھا۔ ان چند گھنٹوں میں ہم پاس کے ہی قبرستان گئے۔ نانا نانی، ماموں ممانی کو ڈھونڈنے۔ کون سی قبر کس کی تھی، تختی نہ ہونے کے باعث نشان دہی نہیں ہوسکی۔ ایک قبر پکی تھی جو صدیوں سے کسی صدر اعلیٰ صاحب کی مشہور تھی۔ بڑے سرکاری عہدے پر فائز یہ یقیناً ہمارے کہیں نہ کہیں سے نانا ہوتے ہوں گے۔ ان کا نام پتا صرف صدر اعلیٰ کے طور پر ہی تھا۔ کوئی بڑا موجود نہیں تھا کہ شجرۂ نسب سے انہیں جوڑ پاتا۔

اماں کے گھر سے جڑی ایک سرخ اینٹوں کی بڑی لمبی چوڑی حویلی تھی جو ہمیشہ سے پراسرار تھی جس میں چالیس یا پچاس کمرے تھے اور دو یا تین منزلہ تھی۔ چھوٹے سے اس گاؤں کی یہ سب سے بڑی عمارت تھی جو ہماری اماں کے بچپن یا اس سے بھی پہلے کسی اعلیٰ عہدے والے رشتے دار کی تھی لیکن کبھی آباد نہ ہوسکی۔ اس میں ہمیشہ جن بھوت کا بسیرا ہی رہا۔ پرانی کہانیوں میں یہاں کسی قیمتی خزانے کے ہونے کا قصہ بھی پایا جاتا تھا۔ کئی بار مختلف مقامات پر کھدائی بھی کی گئی مگر اس کے لوگ

کسی نہ کسی طرح کھدائی چھوڑ کر چلے جانے پر مجبور ہو گئے شاید جن بھوت نے انہیں پریشان کیا ہو؟ بعض زمینیں بے ثمر ہی رہتی ہیں۔ اپنے زمانے کی یہ حسین ترین عمارت اندر سے کھنڈر بن چکی ہے، باہر سے چار دیواری سلامت ہے۔ اس کی ایک دیوار ہمارے نانا کے گھر کے آنگن میں کھڑی ہے۔ نانا کا گھر ہمیشہ آباد رہا۔ ہاں البتہ مکین گھٹتے گئے، مکانیت گرتے گرتے سمٹ کر رہ گئی ہے۔ دور دور تک زمین خالی پڑی ہے۔ نیم اور گولر کے اونچے اونچے درخت ایستادہ ہیں۔ اب نہ گولر چننے ادھر کوئی جاتا ہے نہ نمکولی چننے۔ اتنی زمین پاکستان میں ہمارے پاس ہو تو اس کا ایک ایک انچ ہم استعمال میں لے آئیں۔ وہاں کوئی پوچھنے والا بھی نہیں۔

گھر کے باہر کچھ دور پر ایک مسجد ہے جس کی دیکھ بھال اب بھی نانا کے گھر والوں کی ذمے داری ہے۔ چھوٹی سی یہ مسجد بنوائی تو جانے کس نے ہوگی مگر ہاں ہمیں یہ روایت ضرور معلوم ہے کہ اماں کی پیدائش کے دن نانا نماز پڑھنے وہاں گئے تھے اور جب تک بیٹھے رہے کہ اماں کی پیدایش کی خبر نہ آ گئی۔ تمام نمازیوں نے شکرانے کی نماز ادا کی اور اجتماعی دعا مانگی، اماں کی درازیٔ عمر اور اچھی قسمت کی۔ قسمت صرف اس حد تک اچھی پائی کہ جب تک اپنے گھر رہیں، ماں باپ کی آنکھ کا تارا رہیں اور سسرال گئیں تو نامی گرامی خاندان اور خوبیوں سے بھرا شوہر ملا۔ اپنے لیے عمر کی دعا تو قبول کرا کر آئی تھیں کہ نوے برس تک زندہ رہیں مگر شوہر کے گھر والوں کی دعا قبول نہیں ہوئی کہ وہ زندگی کے صرف چالیس سال ہی پورا کر پائے۔ اماں کو پانچ بچے دیے اور خود رخصت ہو گئے۔

نانا کے گھر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہاں ان کی زندگی بھر کے روزنامچوں کا ڈھیر تھا۔ بقول اماں، وہ زندگی بھر لمحے لمحے کی داستان لکھتے رہے۔ ڈائری لکھنے کی یہ عادت ان دنوں اکثر لوگوں کو ہوتی تھی مگر نانا کو ضرورت سے زیادہ تھی۔ میں ہمیشہ سوچتی کہ اگر میں کبھی یہاں آئی تو اتنے دن ضرور رہوں گی کہ اس کا ایک ایک حرف نہ پڑھ لوں لیکن جب آئی تو سیکڑوں رجسٹر کی تو بات کیا ایک ڈائری بھی سلامت نہیں ملی۔ دیوار گر گئی، دب گئی۔ بارش آئی، بہہ گئی۔ دیمک لگ گئی، بکھر گئی۔ بس یہی بیان جاری ہوا۔ ہمیں تو ایک لائن بھی میسر نہیں ہوئی کہ ان کی لکھائی ہی دیکھ لیتے۔

سوچتے ہیں اگر وہ سب ہوتیں، سب پڑھ لی جاتیں تو گھر میں روزانہ ہونے والا ایک ایک واقعہ اور گزرنے والا ایک ایک لمحہ پتا چل جاتا۔ کچھ دیر ہم بھی ان کے ساتھ، ان کے دور میں جی لیتے۔

پاس پڑوس، رشتے داروں، ملکوں ملکوں کی ساری خبریں تاریخ وار ملتیں، کس قدر دلچسپ ہوتیں یہ باتیں کہ جس عہد میں آپ نہ رہے ہوں اس عہد کی ہر ایک خبر سے آپ واقف ہوں۔ بس مجھے یہاں آنے میں بہت دیر ہوئی، سب ڈائریاں میرا انتظار کرتے کرتے فنا ہوگئیں۔

عجیب بات تھی، جہاں جاتی، دیر سے آنے کا طعنہ ملتا رہا۔

یوسف پور، محمد آباد سے جُڑے بڑے بڑے لوگوں کے نام یاد آئے۔ خلافت تحریک کے حوالے سے مشہور ہونے والے ڈاکٹر مختار انصاری، حکیم نابینا، اور گرم دیوان صاحب، کیسی کیسی نابغۂ روزگار ہستیاں اس چھوٹے سے گاؤں نے پیدا کی تھیں یا ان سے جُڑی رہیں۔ تاریخ کے اوراق روشن ہیں۔ ڈاکٹر مختار انصاری تحریکِ خلافت کے روحِ رواں تھے جو انتہائی ایثار پیشہ رہنما تھے۔ ترکی جانے والے وفد کی قیادت بھی کی تھی۔

حکیم نابینا کے کمالات تاریخ کی کتابوں میں دفن ہیں اور گرم دیوان صاحب مجذوب کی کیفیت یہ تھی کہ جب جلال میں آتے تب من بھر آٹے کی روٹی ان کی پیٹھ پر پکائی جاتی تھی۔

مَیں نے ان بزرگوں کے قصے اماں کی زبانی بھی سنے تھے اور مزید جاننے کے لیے کتابیں بھی پڑھیں۔ یوسف پور، سلیم پور، محمد آباد ایک ہی گاؤں کے مختلف نام ہیں۔ یہ ہستیاں یہاں سے ہی متعلق تھیں۔

واپسی کے سفر میں میری سوچ پھر ہجرت کی سوئی پر اٹکی ہوئی تھی۔ ہجرت اور سرحد پار رشتوں کی دوری تاریخ کی ایک ایسی اندوہناک داستان ہے جسے لکھنے سے قلم تک رو پڑے اور جسے پڑھنے سے آنکھیں نابینا ہو جائیں۔ جس گھر سے مَیں لوٹ رہی تھی، منہدم ہوتے ہوتے ایک کمرے تک محدود ہو چکا تھا۔ آمنے سامنے، دائیں بائیں کی ساری زمینیں اپنے رکھوالوں سے محروم ہیں بس گھنے درخت اور نوکیلی جھاڑیاں ہی ان زمینوں کی پاسبان بنی ہوئی ہیں۔

یہاں میرے جذبات بڑے ٹوٹے پھوٹے تھے۔ گاؤں کے بچے کھچے لوگ میری آمد کی

اطلاع پاکر دوڑے چلے آئے تھے۔ہم آمنے سامنے تھے اور ایک دوسرے سے ناواقف تھے۔ان کے لوگ اور ہمارے لوگ آپس میں تعلقات رکھتے تھے۔بس ان کی ہی لاج ہم دونوں فریق رکھے ہوئے تھے سب اماں کے ہی رشتے سے ملے تھے خوش بھی تھے،اداس بھی۔

مَیں نے اماں کو چودہ برس پہلے کھودیا تھا۔کاش ان کی زندگی میں یہاں آتی اور واپس جاکر انہیں ان کے گھر کی کہانی سناتی۔مگر کہانی سنانے کے لیے رہ بھی کیا گیا تھا۔ایک بوسیدہ سا مکان۔ میلوں پھیلی ہوئی بے آباد زمین۔پھلوں کے باغ،سبزیوں اور اناج کے سارے کھیت جیسے ان کے غم میں مرجھا گئے ہوں۔زمینوں نے کبھی کچھ نہ اگانے کی قسم کھالی ہے۔اب نہ اس گھر میں ڈھیروں سنگھاڑے آتے ہیں نہ منوں ٹنوں آم۔نہ گیہوں،نہ جو،نہ باجرہ۔اماں کا یہ گاؤں مجھے اشک بار نظر آیا۔مَیں بھی اشک بار تھی۔یہی تو میرے پاس ایسا خزانہ تھا۔لٹاتی جاتی تھی اور خالی بھی نہیں ہوتی تھی۔

اماں کے ایک ملازم سے بھی ملی جو''اماں کی بٹیا'' سے ملنے دوڑا دوڑا چلا آیا تھا۔ہندو تھا اور محبت کے جذبے سے سرشار تھا۔اس نے آتے ہی میرے پاؤں چھوئے۔اس کے دونوں ہونٹ خوشی سے کُھلے ہوئے تھے اور آنکھوں میں یادیں سمیٹے وہ اِک ٹک مجھے دیکھ رہا تھا۔اور اماں کی ایک جھلک میرے چہرے پر پانے کے لیے بےچین تھا۔شام کے سائے گہرے ہورہے تھے اور ہم دھیرے دھیرے اماں کا گاؤں دور چھوڑ آئے تھے،ہمیشہ کے لیے۔اب ہمیں کب یہاں آنا تھا۔

❑

پھر دہلی کی طرف رواں

اعظم گڑھ، اپنی میزبان بہن کے گھر دوبارہ لوٹ کر آ گئی تھی اور اب دوسرے دن کی اسی ٹرین پر پھر بیٹھنا تھا جس سے ہم علی گڑھ سے یہاں تک آئے تھے اور اب ہماری منزل دہلی تھی کہ واپس پاکستان جانے کے دن قریب آ رہے تھے۔

یہ 31 مئی کی رات تھی۔ ہمیں یکم جون کو دہلی میں ہونا تھا اور 2 جون کو پی آئی اے کے ذریعے کراچی روانہ ہونا تھا۔ لیکن میرے پاس اطلاع آئی کہ 2 جون والی کراچی کی فلائٹ کینسل ہو گئی ہے۔ اگر مَیں چاہوں تو ایک آخری فلائٹ 4 جون کو دہلی سے روانہ ہو گی، اس سے لوٹ جاؤں کہ اس کے بعد کراچی کے لیے تمام فلائٹس غیر معینہ مدت کے لیے بند ہیں۔

اب تک ہر بات پروگرام کے مطابق تھی مگر ایسا کیسے نہ ہوتا کہ سرحدوں پر کھچاؤ نہ پیدا ہو۔ ہم نے جھٹ 4 جون کی فلائٹ کی ہامی بھر لی جبکہ میرے لیے وہ موزوں یوں نہیں تھی کہ وہ براہِ راست کراچی نہیں جا رہی تھی۔ دہلی سے لاہور اور پانچ گھنٹے طویل انتظار کے بعد دوسرا جہاز مجھے کراچی پہنچائے گا۔ مجھے دو دن دہلی میں رکنے پر کوئی اعتراض نہ تھا کہ وہاں ارتضیٰ کریم صاحب میرے منتظر تھے۔ سفر کے شروع میں میری ان سے ملاقات نہیں ہو پائی تھی۔

اپنی بہن بلقیس کے گھر میں مجھے میکے کا مزہ ملا تھا۔ اس کی بہو شگفتہ اور بچوں نے بہت محبت دی۔ اعظم میرا بھانجا تھا مگر بیٹوں کی طرح خاطرداریاں کر رہا تھا۔ مَیں زندگی میں ایک بار ان سے ملی تھی اور رشتے کی تجدید کے بعد واپس جا رہی تھی۔

''مجھے نہ دل رات کا سفر ہے'' مجیب عالم کی گائی ہوئی اس غزل کے بول میں بلا کا تاثر ہے۔ یہ تاثر لیے میں ٹرین میں بیٹھ گئی۔ اب کے میری میزبان، میری بہن میرے ساتھ نہیں تھی۔ مَیں اکیلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

ریل کے ڈبے کے شیشوں میں اب بھی پانی اٹکا ہوا تھا۔ شاید قصداً مگر کیوں؟ یہ معمہ حل نہیں ہوا اور واپسی پر بھی مجھے کوئی اسٹیشن نظر نہیں آیا مگر ہاں شدید گرمی کے باوجود ڈبے کی ٹھنڈک بڑی معقول تھی۔ مجھے علی گڑھ، آگرے، اعظم گڑھ، غازی پور اور گرد و نواح کے گاؤں کا ایک ایک منظر دوبارہ یاد آ رہا تھا۔ علی گڑھ میں صغیر افراہیم کی مہربانیاں، مہر الٰہی ندیم کی محبتیں۔ ریاض الرحمٰن شیروانی کی قربت، حکیم ظل الرحمٰن کے عجائبات، شعبۂ اردو کے تمام اساتذہ اور طلباء، مولانا آزاد لائبریری، سرسیّد ہاؤس، تہذیب الاخلاق کا دفتر، گیسٹ ہاؤس، حامدہ آپا اور سعید بھائی حتیٰ کہ وہ گاڑی والا جو دو دن میرے ساتھ ساتھ رہا۔ منٹو-E (یونیورسٹی کا قبرستان)۔ وہ تمام گھر، وہ لوگ جو مجھے اس شہر میں ملے۔ وہ ہوائیں، وہ فضائیں جو علی گڑھ کی تھیں جن کے لمس اور خوشبو کے لیے مَیں مدتوں سے ترس رہی تھی۔

آگرہ کالج اور سینٹ جانس کالج کے دونوں پرنسپل اور اسٹاف کالج کی خاموش عمارتیں جو میرے ابا کی موجودگی کا احساس اپنے اندر رکھتی ہیں، مجھے کیوں نہ یاد آتے۔ سب کچھ تو یاد آتا رہا۔ تاج محل کی خوب صورتی اور مغلیہ دور کی بے شمار عمارتیں جو پورے آگرہ میں پھیلی ہوئی ہیں، مجھے سب یاد آ رہی تھیں۔ ٹرین جس رفتار سے چلتی ہے، ذہن اس سے دگنی رفتار سے چلتا ہے۔ مَیں پل بھر کو بھی تو نہیں سوئی۔ آنکھوں پر بڑا بوجھ تھا۔ جگہ جگہ آنسو بہانے کا بوجھ اور کئی کئی راتوں کے رَت جگوں کا بوجھ۔ مگر کبھی کبھی تو زندگی کی بے ترتیبی بھی بھا جاتی ہے۔

یکم جون کی دوپہر تک ہم پھر دہلی کے اوریئنٹ ہوٹل میں واپس آ چکے تھے۔ اس شام ہم نے ادھر اُدھر کے بازار دیکھے، کچھ خریدنا تو تھا نہیں کہ وزن میں کتابیں پھر شامل تھیں اور پی آئی اے بار بار مہربان نہیں ہوگا۔ اب کیا چیز پاکستان میں نہیں ملتی۔ دنیا کے ہر ملک کا ہر برانڈ یہاں کے اونچے اونچے مال کی خوبصورت دکانوں میں بھرا پڑا ہے۔ وہ زمانہ گیا جب ہم ہر باہر سے آنے والوں کے A فارم حاصل کرنے کی کوشش کرتے کہ جس سے ڈالر میں ڈیوٹی فری شاپ سے من

پسند اشیاء خرید سکیں۔ وہ دور بھی ہر دور کی طرح گیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان دنوں ڈیوٹی فری شاپ کی خریدی ہوئی چیزوں نے ہمیں گھر سجانے میں بڑی مدد دی تھی۔ پہلا مائیکرو ویو اور سینڈوچ میکر ہمیں وہاں سے ہی ملا تھا۔ کئی لوگوں نے تو آ کر ہمارے گھر ان چیزوں کی زیارت بھی کی تھی۔ جب ہم نے پہلی بار اپنے نئے نئے کچن میں ڈش واشر لگایا تھا تب گرم گرم پلیٹ میں کھانا کھانے میں کس قدر خوشی محسوس ہوئی تھی۔ ہم نے رائس میکر بھی وہیں سے لیا تھا اور جب اپنے کالج اسٹاف سے اس کا تذکرہ کیا تھا تب وہ سب ہماری چیزیں دیکھنے گھر آئے تھے۔ مگر زمانہ جلدی جلدی کلینڈر بدل دیتا ہے۔ سال بہ سال یوں گزر گئے کہ پتا بھی نہیں چلا۔ ہماری عمریں بڑھ گئیں اور شوق گھٹ گئے لیکن ہمارے اپنے شہر کے بازار ہزارہا غیر ملکی اشیاء سے بھر گئے۔ اب ہمیں بغیر A فارم کے سب چیزیں روپے ہی میں مل جاتی ہیں۔ خرید بھی لیتے ہیں مگر وہ مزہ کہاں جو اُن دنوں آتا تھا۔ وسائل کم تھے، خواہشات زیادہ بھی اور شدید بھی۔ تھوڑا بھی پورا ہو جائے تو کئی دن سرشار رہا کرتے تھے۔

دہلی کا بازار اشیاء سے بھرا تھا۔ مگر ضروریات اب رہ بھی کہاں گئی تھیں۔ پھر بھی کچھ مقامی چیزیں ایسی ضرور ہوتی ہیں جنہیں تحفے کے طور پر خریدا جاتا ہے۔ مَیں نے بھی ایسی چیزوں پر ہاتھ رکھا جو وزن میں کم سے کم ہوں۔ وہ تمام چیزیں بچوں کے بچوں کے لیے تھیں۔

ممبئی اورینٹ ہوٹل، جامع مسجد نمبر ایک کے گیٹ کے عین سامنے والی گلی میں ہے۔ کراچی سے دہلی آ کر بھی ہم وہیں ٹھہرے تھے اور واپسی پر بھی اسی ہوٹل میں گئے۔ اگر چہ یہ ہوٹل ایئرپورٹ سے کافی دور ہے۔ دوبارہ اس ہوٹل میں کمرہ لینے کے لیے ہمیں تقریباً دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا کہ نیچے کی منزل پر کوئی کمرہ خالی نہیں تھا۔ ہم انتظار کے لیے ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ انقلاب اور سہارا دونوں اخبار اس ہوٹل میں آتے تھے اور ان دونوں ہی میں ہماری تصویریں چھپ چکی تھیں، جب ہم علی گڑھ میں تھے اور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی جانب سے جناب صغیر افراہیم صاحب کے مہمان تھے۔ وہاں ہم نے ایک مضمون سنایا تھا بس اسی کی روداد ان دونوں اخباروں میں شائع ہوئی تھیں جس کا تراشہ ہمیں افراہیم صاحب نے عطا کر دیا تھا۔ اخبار پڑھتے پڑھتے معلوم ہوا کہ ایک کمرہ خالی ہوا ہے جو فوری طور پر ہمارے نام کر دیا گیا ہے۔ ویزے کی فوٹو کاپی پہلے بھی ہم نے جمع کرائی

تھی اور اس بار بھی جمع کرانی پڑی۔ رجسٹر میں ہمارے نام کا خاص طور پر اندراج کیا گیا تھا اور چیک آؤٹ کرتے ہوئے ہمارے دستخط بھی لیے جاتے تھے۔ ہوٹل میں سامان رکھتے ہی جناب ارتضٰی کریم سے رابطہ ہوا، وہ ہمیں دہلی یونیورسٹی بلانا چاہتے تھے۔

محترم ارتضٰی کریم چند سال قبل آرٹس کونسل کراچی کی سالانہ اردو کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے تھے اور ہم نے چاروں دن سارے سیشن میں انہیں سنا بھی تھا۔ آخری دن ملاقات بھی کی اور اپنے ابا کا کلام ''افکارِ حسن'' یہ کہہ کر انہیں دیا کہ اگر وہ اسے اپنے ساتھ ہندوستان لے جائیں اور اپنی یونیورسٹی کی لائبریری میں رکھ دیں تو میری وہ شدید خواہش پوری ہو جائے گی جو اس کی اشاعت کے بعد سے میں رکھتی تھی لیکن خود ہندوستان جانے کی کوئی سبیل نہیں تھی۔

ارتضٰی کریم صاحب نے اس وعدے کے ساتھ یہ کتاب مجھ سے لے لی تھی کہ وہ ضرور میرا یہ کام کر دیں گے۔ مَیں انہیں شاید اس کتاب کے باعث یاد رہ گئی تھی۔ دہلی یونیورسٹی میں بھی گرمیوں کی تعطیلات تھیں لیکن انہوں نے شعبے کے اساتذہ کو بلا لیا تھا۔ یہ ان کی مہربانی تھی۔ صدرِ شعبہ اور دیگر اساتذہ سے میری ملاقات ہوئی۔ گفتگو بھی ہوئی اور پھر سے اپنی اور ابا کی کتاب شعبۂ اردو کی لائبریری میں رکھنے کے لیے دی۔ اساتذہ نے جس گرم جوشی سے استقبال کیا اسے مَیں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔

یونیورسٹی کا شعبۂ فارسی بھی دیکھا جس کے صدر ہندو تھے۔ نام کی تختی لگی تھی، اچھا لگا کہ ہندوستان میں ہندی کے علاوہ دیگر زبانیں بھی شوق سے پڑھی اور پڑھائی جاتی ہیں۔

دہلی یونیورسٹی کا کیمپس میلوں پر پھیلا ہوا ہے۔ کئی گیٹ ہیں اور عمارت بھی خوبصورت ہے بطورِ خاص باہر کا حصہ جہاں ہرے بھرے پیڑ پودے انتہائی سلیقے سے لگے ہیں۔

صدرِ شعبہ کی تواضع کے بعد ارتضٰی کریم صاحب خود ہمیں اپنی گاڑی میں لے کر اردو اکیڈمی دکھانے لے گئے۔ سیکریٹری اردو اکیڈمی جناب انیس احسن اعظمی بڑے تپاک سے ملے۔ ہم نے دیوار پر لگے بورڈ کو پڑھا، سیکریٹریز کی ترتیب اور فہرست موجود تھی۔ انیس احسن اعظمی آٹھویں سیکریٹری ہیں۔ وہاں کئی اور عہدیدار بھی موجود تھے، ہر ایک کا نام تو مجھے یاد نہیں رہ گیا لیکن شکلیں آنکھوں میں محفوظ ہو گئیں۔ پھر کئی ایک تصاویر بھی کھینچی گئیں جو تادیر یادگار کے طور پر البم میں

موجود ہوں گی۔

انیس اعظمی صاحب کا دفتر ٹھنڈا تھا۔ باہر کی شدید گرمی سے آنے کے بعد اور بھی اچھا لگا حالانکہ انہوں نے گرم جوشی سے استقبال کیا تھا۔ کولڈ ڈرنک کے ساتھ ٹھنڈے کھیرے بھی کھانے کو ملے۔ مَیں نے شاید پہلے بھی لکھا ہے کہ ہر جگہ کھیرے ٹھیلے پر بکتے دیکھے۔ پتا چلا کہ بس بیج کہیں بھی پھینک دیں، کھیرے اُگ آتے ہیں۔ مجھے سب سے اچھی بات یہی لگ رہی تھی کہ مَیں ابا کا کلام ان کے ملک میں جگہ جگہ پہنچا رہی تھی جسے وہ تو ایک چھوٹی سی ڈائری میں بند کر کے جلدی میں دنیا سے چلے گئے اور مَیں نے بہت دیر میں اسے کتابی شکل دی۔ بس یہ کام مجھ سے کیسے ہو پایا؟ یہ بس خدا نے کرا دیا ورنہ میرے بس کی بات ہی نہیں تھی۔ اردو اکیڈمی دہلی کی لائبریری میں تصویر اور کلام کے ساتھ ان کی شرکت چھ دہائیوں بعد ہوئی۔

اکیڈمی کی تفصیلات جاننے کی مَیں خواہاں تھی، سو انیس صاحب نے ہمیں خاصا وقت دیا اور تفصیلات سے آگاہ کیا۔ اردو کی نشوونما اور اسے فروغ دینے میں دہلی کا اہم اور تاریخی کردار رہا ہے۔ 1980ء میں، محترمہ اندرا گاندھی نے 31 مارچ 1981ء کو دہلی میں اردو اکیڈمی کے قیام کا اعلان کیا۔ اس وقت اس کا بجٹ پچاس ہزار روپے تھا۔

اس وقت دہلی کی وزیرِ اعلیٰ شیلا دکشت اس کی چیئر پرسن ہیں۔

اردو اکیڈمی نے اردو کی ترویج و ترقی کے لیے جو پروگرام ترتیب دئے ہیں اُن میں دو ماہناموں کی اشاعت ہے۔ ایک ''ایوانِ اردو'' اور دوسرا ''امنگ'' ہے۔ ان دونوں جریدوں کی تقریباً 12000 کاپیاں شائع ہوتی ہیں جن میں مضامین کے علاوہ افسانے، غزلیں، نظمیں، انشائیے، خاکے اور تاریخی مضامین شائع ہوتے ہیں۔

دوسرا اہم کام جو اردو اکیڈمی کر رہی ہے وہ کتابوں کی اشاعت ہے۔ اس وقت تک یہاں سے تقریباً 169 کتب شائع ہو چکی ہیں۔

اس کے علاوہ مسوّدات پر مالی اعانت بھی کی جاتی ہے۔

کتابوں کی نمائش کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔

ایک اہم کام بزرگ ادیبوں کو فیلو شپ جاری کرنا ہے۔ یہ پانچ ہزار روپے ماہانہ ہے۔

وقتاً فوقتاً یہاں سیمینار اور مختلف موضوعات پر مذاکرے بھی ہوتے ہیں۔ ''نئے پرانے چراغ'' کے نام سے دہلی کے مختلف اصنافِ ادب کے قلم کار شرکت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ادبی ملاقاتیں بھی ہوتی ہیں۔

اردو ڈراما پر بھی خاطر خواہ کام ہو رہا ہے۔ یوں باقاعدگی سے ڈرامہ فیسٹیول منعقد ہوتا ہے۔ کوچنگ کلاسز، اردو لٹریسی سینٹر، دہلی کی دیگر لسانی اکیڈمیز کے ساتھ مل کر مشترکہ پروگرام بھی ہوتے ہیں۔

اکیڈمی کی اپنی مرکزی لائبریری کا نام داراشکوہ لائبریری ہے۔ اس میں تقریباً 38000 کتابیں اور ایک سو پچاس کے قریب نایاب مخطوطات بھی موجود ہیں۔

دہلی سے نکلنے والے مختلف اخبارات کے لیے گوشے بھی بنائے گئے ہیں۔ کتابت، اردو کمپیوٹر اور شارٹ ہینڈ کے مراکز بھی موجود ہیں۔

اکیڈمی درس و تدریس کے لیے اردو اساتذہ کی فراہمی کا فریضہ بھی انجام دے رہی ہے۔

مَیں نے ارتضٰی کریم، انیس احسن اعظمی اور دیگر لوگوں کا شکریہ بھی ادا کیا، اپنی طرف سے اور اپنے مرحوم ابا کی طرف سے بھی۔

ارتضٰی کریم صاحب ہمیں دفتر میں چھوڑ کر کچھ دیر کے لیے غائب ہو گئے تھے۔ ہم سمجھے بس اب وہ ہمیں یہاں تک لا کر چلے گئے ہیں مگر بغیر الوداعی دعا سلام کے جانا، ایسا تو ممکن نہیں تھا۔ میرا خیال درست نکلا، وہ لائبریری چلے گئے تھے اور رشید احمد صدیقی کی ''گنج ہائے گرانمایہ'' اپنے ساتھ لیتے آئے۔ میرا مکمل تعارف کرانے کے لیے اس لمحے مَیں ان کی بہت مشکور ہوئی۔ ان کی محبت کہ انہوں نے میری ولدیت کو اتنی اہمیت دی۔ انہوں نے کہا بھی، بہت وقت گزر گیا اب حسن عبداللہ صاحب پر کام بھی ہونا چاہیے۔

مجھے معلوم نہیں کہ ارتضٰی کریم صاحب آگے کیا کریں گے؟ مَیں ان سے فون پر رابطے میں رہوں گی لیکن فی الحال غالباً وہ ہندوستان میں نہیں ہیں۔ کہہ رہے تھے امریکا جانے والے ہیں۔

اردو اکیڈمی کے بعد ارتضٰی صاحب نے ہمیں اردو اکیڈمی کی گاڑی میں سوار کر کے غالبؔ انسٹیٹیوٹ روانہ کر دیا اور وہاں ہمارے پہنچنے کا فون بھی کر دیا۔

ڈاکٹر سیّد رضا حیدر انسٹیٹیوٹ کے ڈائریکٹر، ہمیں منتظر ملے۔ غالبؔ انسٹیٹیوٹ، ایوانِ غالبؔ مارگ پر ماتا سندری لین میں واقع ایک خوبصورت عمارت میں قائم ہے۔ ہم نے سب سے پہلے غالبؔ میوزیم دیکھا۔ بورڈ پر بیگم عابدہ احمد کا نام بھی تحریر تھا، یقیناً یہ انہوں نے یا ان کے تعاون سے بنایا گیا ہوگا۔ میوزیم کیا تھا، اگر خود غالبؔ صاحب دیکھ لیں تو خوشی سے پھولے نہ سمائیں۔ جابجا دیواروں پر شوکیس میں تصویروں میں ان کی زندگی کے عکس نمایاں تھے۔ خود میوزیم کے بورڈ کے اوپر ایک تختی ان کے شہرہ آفاق شعر کی لگی ہوئی تھی۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

اور اس تختی کے بالکل برابر دوسرا شعر تحریر تھا۔

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ سے ہی نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

غالبؔ کی تصاویر، کتابیں، قلمی نسخے، وہ تمام کتابیں بھی جو ان پر لکھی گئیں۔ ان کے اشعار کی تشریح تصویروں میں۔ وہ مشاعرے جو ان کی زندگی میں ہوئے۔ ان کی عکاسی اور وہ شعرا جو ان کے ساتھ مختلف مشاعروں میں شریک رہے۔ سامنے کھڑے ہو کر دیکھتے ہوئے اصلیت کا گماں ہو رہا تھا اور یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ہم اس دور میں پہنچ چکے ہیں اور خود مشاعرے میں شریک ہیں۔

ان کے زمانے کے برتن، کپڑے، دیگر اشیاء نمونے کے طور پر بڑے سلیقے اور خوبصورتی سے رکھے ہوئے تھے۔ ہم نے اس ڈومنی کی تصویر بغور دیکھی، اس کے انداز اور کپڑے اپنی طرف متوجہ کر لیتے۔ اسی لیے بطور خاص ہم نے وہاں تصویر بھی کھچوانی ضروری سمجھی کہ بعد میں بھی دیکھ کر ان لمحوں کو یاد کریں گے جو انسٹیٹیوٹ میں گزرے۔ غالبؔ کی قدِ آدم تصاویر اور انسٹیٹیوٹ کے باہر ان کا مجسمہ جو خوبصورت پیڑ پودوں کے ساتھ بنا ہوا ہے۔

ہندوستان حکومت کے وہ ٹکٹ جو مرزا غالبؔ کے نام سے مختلف مواقع پر چھپے خوبصورت فریم میں آویزاں تھے۔

وہی غالبؔ جن کے اشعار ان کے دور میں کسی کی سمجھ میں نہیں آتے تھے اور خود غالبؔ کہتے بھی تھے کہ میرا اردو کلام تو بس ایسے ہی زندہ رہا میں تو فارسی کلام کے باعث زندہ رہوں گا۔ مگر انہوں نے اپنے بارے میں بڑا غلط اندازہ لگایا تھا۔ فارسی کلام اپنی جگہ مگر اردو کلام نے انہیں ہندو پاک کا نہیں دنیا کا بڑا شاعر بنا دیا۔

انسٹیٹیوٹ کی نگراں خاتون پوری توجہ سے اپنی کام میں مصروف تھیں۔ مجھ سے تپاک کے ساتھ ملیں اور واپسی پر ایک رجسٹر بھی سامنے رکھ دیا کہ اس میں اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ جملوں میں خیالات لکھ دیے مگر جذبوں کو اپنے ساتھ لے آئی۔

غالبؔ انسٹیٹیوٹ کے رضا حیدر صاحب نے ہمیں ایک ایک کونا دکھایا۔ سب سے اچھا ہمیں وہ آڈیٹوریم لگا جہاں وقتاً فوقتاً مشاعرے اور سیمینار ہوتے ہیں اور ہندوستان ہی نہیں دیگر ممالک کے ادیب اور شاعر بھی شرکت کرتے رہتے ہیں۔

غالبؔ انسٹی ٹیوٹ کے قیام کا خیال ڈاکٹر ذاکر حسین کا ہے جو ہندوستان کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔ 1969ء میں غالبؔ کی صدی کی تقریبات کے موقع پر مسز اندرا گاندھی نے فخر الدین علی احمد کو جو ہندوستان کے صدر رہ چکے تھے کمیٹی کا سکریٹری مقرر کیا۔ 1971ء میں غالبؔ انسٹی ٹیوٹ کا قیام عمل میں آیا اور اب یہاں علمی اور ثقافتی ترقی کے پروگرام باقاعدگی سے ہوتے ہیں۔

غالبؔ انسٹی ٹیوٹ کی اپنی بلڈنگ ہے۔ جہاں ایک لائبریری جناب فخر الدین علی احمد کے نام پر قائم ہے۔ ایک میوزیم ہے۔ خوب صورت آڈیٹوریم ہے اور گیسٹ ہاؤس بھی ہے۔

یہاں سالانہ سیمینار دسمبر کے مہینے میں منعقد ہوتا ہے جو عالمی سطح کا ہوتا ہے۔ یہ سیمینار غالبؔ کے عہد کے لوگوں، بہادر شاہ ظفرؔ، ذوقؔ، مومنؔ وغیرہ کے بارے میں ہوتا ہے اور دنیا بھر سے محققین سیمینار میں شرکت کرتے ہیں۔

غالبؔ ایوارڈ اردو نثر، شاعری تنقید اور ڈرامہ پر دیا جاتا ہے۔

ہر سال مشاعرہ بھی منعقد ہوتا ہے۔ غالبؔ نامہ نام سے ایک جرنل بھی ہر چھ ماہ میں شائع ہوتا ہے۔

غالبؔ میوزیم بیگم عابدہ احمد کے نام سے قائم ہے۔ اس میوزیم کا افتتاح اکتوبر 1977ء

میں ہوا۔ یہاں بہت سی ایسی نادر اشیاء رکھی ہیں جو غالبؔ اور ان کے عہد پر روشنی ڈالتی ہیں۔
سینکڑوں افراد روزانہ اس میوزیم میں آتے ہیں۔ میوزیم کی انچارج یاسمین فاطمہ ہیں جو دل لگا کر یہاں کام کر رہی ہیں اور آنے والے لوگوں سے ان کے تاثرات بھی رجسٹر پر لکھواتی ہیں۔ ان کی مہربانی کہ تاثرات قلم بند کرنے کے لیے انہوں نے میرا بھی انتخاب کیا۔
تقریباً ایک سو چار کتابیں پچھلے سال تک یہاں سے غالبؔ کے بارے میں شائع ہوئیں۔
اس انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر جناب رضا حیدر ہیں جن کے پاس تقریباً 20 افراد کا عملہ موجود ہے جن کی مدد سے وہ اسے بخوبی چلا رہے ہیں۔
''ہم سب ڈرامہ کمیٹی'' جس کے چیئر مین پروفیسر ایس آر قدوائی ہیں۔ سیمینار اور ادبی تقریبات کے چیئر مین پروفیسر شمیم حنفی ہیں۔ پبلی کیشن کمیٹی کے چیئر مین ایس آر قدوائی ہیں۔
میوزیم کمیٹی کے چیئر مین محمد شفیع قریشی ہیں۔
لائبریری کمیٹی کی بیگم ورِنیر احمد ہیں۔ غالبؔ نامہ ایڈیٹوریم بورڈ کے چیئر مین پروفیسر ایس آر قدوائی ہیں۔
فنانس کمیٹی کے بھی ڈائریکٹر ایس آر قدوائی ہیں۔
بلڈنگ کمیٹی کے ڈائریکٹر پرویز علی احمد ہیں۔
ایوارڈ کمیٹی کے چیئر مین محمد شفیع قریشی ہیں۔
ان تمام کمیٹیوں میں چار پانچ مشہور و لائق افراد ان کے ساتھ کام کرتے ہیں۔
شام ہونے کو آئی تھی مگر گرمی کی شدت میں کوئی کمی نہیں تھی۔ ہم نے رضا حیدر صاحب سے اجازت لی۔ واپسی پر غالبؔ صاحب کے مجسمے سے دوبارہ ملاقات ہوئی، الوداعی سلام کیا اور انہیں خراجِ عقیدت بھی پیش کیا۔ خاموش کھڑے ہو کر یہ بھی انہیں بتا دیا کہ دلی کے بَلّی ماراں میں ہم ان کا مکان بھی دیکھ آئے ہیں جو آج بھی سلامت ہے اور ان کی یاد دلاتا ہے۔ گلی تنگ ہے، مکان چھوٹا ہے لیکن یہ انتخاب تو خود ان کا تھا۔ سرکارِ ہند کا یہ کمال ہے کہ آج تک اس مکان کو محفوظ رکھا ہے۔ اس پر پیسہ خرچ کر رہی ہے اور یہاں تک پہنچ جانے والوں کو دیکھنے کا موقع فراہم کر رہی ہے۔ ورنہ کتنے ہی باکمال لوگوں کے ٹھکانے مٹ گئے۔

یہ ہماری ہندوستان میں آخری رات تھی۔ تقسیم کے بعد چند سال کی عمر میں ہم نے اس ملک کو چھوڑ دیا تھا۔ بینک میں پیسے، لاکر میں زیور اور ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ۔ شہر اور گاؤں میں کئی گھر، کئی زمینیں، باغ، ہرے بھرے کھیت، عزیز و اقارب، نام، پہچان، عزت، وہ سارے کارہائے نمایاں جو کیے، وہ تمام ادارے جو بنائے یا جن کی مالی مدد کی اور ان کا قیام بھی عمل میں لائے۔

یہ سب کچھ تو الگ لیکن آباء واجداد کی قبریں بھی چھوڑ دیں۔ پھر کبھی ان پر فاتحہ پڑھنے بھی نہیں آئے۔ ہم نے تو اپنے ابا کو بھی یونیورسٹی کے قبرستان میں چھوڑ دیا، بس یہ کیا کہ کتبہ لگا دیا تھا جو آج بھی موجود ہے اور جس کی مدد سے ہم نے ان کے حضور حاضری دے دی۔ جانے وہ ہمیں پہچانے بھی یا نہیں کہ اب ہم بڑے ہوگئے ہیں۔ خدوخال بھی بدل گئے ہیں لیکن مَیں وہ لمحہ کیسے کبھی بھول پاؤں گی جب مَیں پورے قبرستان میں ماری ماری پھر رہی تھی اور وہ نہیں مل رہے تھے۔ پھر ایک جگہ تھک ہار کر مَیں کھڑی ہوگئی تھی اور زور زور سے چیخ رہی تھی۔ ''کہاں ہیں آپ، نظر کیوں نہیں آتے؟ مَیں بہت دور سے آئی ہوں۔ آنے میں دیر ضرور کردی پر آئی تو ہوں نا۔ آپ نے تو جانے میں جلدی کردی تھی۔ ہم نے کب آپ سے شکوہ کیا؟ ہم تو خفا بھی نہیں ہوئے تھے آپ سے، بس چپ ہوگئے تھے۔ بس رو دیے تھے۔ بس یتیم کہلانے لگے تھے، لیکن آپ ہمارے دیر سے آنے پر کیوں خفا ہیں؟ اچھا اگر خفا ہیں تو معاف کر دیجئے نا۔ مَیں آپ کی منی ہوں، آپ کی بیٹی ہوں۔ آپ مجھے نخلِ باغ آرزوئے دل کہا کرتے تھے۔ مَیں وہی تو ہوں۔ آپ مجھے Queen Caroline Philis Victoria بھی تو کہتے تھے۔ وہی کوئین کیرولین آپ کے پاس آئی ہے۔ پھر مَیں سخت گرمی میں کھڑے کھڑے اتنا روئی تھی، اتنا روئی تھی کہ گورکن بھی میرے ساتھ رو پڑا تھا۔ اور جب مَیں نے کہا، کیا مَیں آپ سے بغیر ملے چلی جاؤں؟ تب ایک آواز آئی، پتا نہیں وہ کس کی تھی؟ آپ کی تو آواز بھی مَیں نہیں پہچانتی تھی مگر اس لمحے جان لیا کہ شاید آپ ہی کہہ رہے ہیں۔

آگے بڑھو۔ مَیں آگے بڑھ گئی۔

آپ نے کہا، اور بڑھوں۔ مَیں اور بڑھ گئی پھر آواز بند ہوگئی۔ مَیں نے چاروں طرف بے بسی سے دیکھا، کس سے مدد لوں؟ مَیں اب کھڑی نہیں رہ سکتی تھی۔ میرے پاؤں جل رہے تھے۔

کانٹوں سے زخمی بھی ہو گئے تھے۔ مَیں وہیں بیٹھ گئی۔ ایک قبر پاس ہی تھی۔ قبر کیا تھی بس ایک ابھار تھا۔ پوری کی پوری جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھی، اسی میں سرہانے کی تختی بھی چھپ گئی تھی۔

مَیں نے ہاتھ بڑھا کر جھاڑی ہٹائی، کتبہ نظر آیا، اسے صاف کیا، آپ کا نام نظر آ گیا۔ مَیں کتنا روئی۔ رونے کی حد کر دی۔ پھر کتنی خوشی ہوئی۔ کیا آپ نے میری آواز سن لی تھی۔ مجھے آپ ہی آگے بڑھنے، بڑھتے رہنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ آپ چاہتے تھے مَیں آپ سے ملے بغیر نہ جاؤں۔

مَیں اس لمحے کا تذکرہ بہتوں سے کر چکی ہوں۔ اگر یہ کھلی آنکھوں سے خواب تھا تو اس کی تعبیر کون کیسے کرے گا؟

کئی ایک لوگوں نے کہا، ہاں قبر میں اندر لیٹے ہوئے لوگ آواز سنتے ہیں اور جواب بھی دیتے ہیں، بس ہم زندہ لوگ سن نہیں پاتے۔ اگر یہ حقیقت ہے تب ابا آپ نے تو میری آواز سن لی نا۔ آپ کا شکریہ، یقین کیجئے آپ میرے وجود میں ہمیشہ سے زندہ ہیں۔ جب تک مَیں زندہ ہوں آپ بھی مجھ میں زندہ رہیں گے۔ یقین کیجئے ابا مَیں نے آج تک جتنی بھی نمازیں پڑھی ہیں، دعا میں آپ کا نام سب سے پہلے لیا ہے۔ آپ سے یہ ملاقات مَیں کبھی نہیں بھول پاؤں گی۔

مَیں دیر تک پندرہ دن پہلے والی ملاقات یاد کرتی رہی اور شاید یہی یاد کرتے کرتے سو جاتی کہ شعیب کا فون آ گیا جو کراچی میں میری بھابھی کا بھانجا ہے۔ آپ کو ہمارے گھر آنا ہے؟

مگر کیسے؟ اب تو وقت بہت کم ہے، صبح میری فلائٹ ہے۔

کچھ نہیں سننا۔ اور پھر مجھے اس کے گھر جانا پڑا۔

شعیب اور امینہ جس محبت سے ملے اس کا تو کیا کہنا۔ جامع مسجد سے اس کا گھر کوسوں دور تھا۔ مگر گھر اور اس کا اطراف بہت اچھا۔

شعیب نے کھانے کا انتظام کر رکھا تھا مگر ان کے ایک اور پڑوسی نے جو علیگ تھے، مع کھانے کے اپنے گھر بلا لیا، یوں دو گھروں کا کھانا ایک میز پر چنا گیا۔ وہ پڑوسی وہاں کے مشہور ڈاکٹر تھے اور سر سے پیر تک علیگ تھے۔ بڑے قصے سنائے اور مزے مزے کے کھانے کھلائے۔

آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی، صبح کی فلائٹ تھی، شعیب کا کہنا تھا، رات رک جائیں،

سامان صبح ہوٹل سے لیتے ہوئے ایئرپورٹ چلے جائیں گے مگر ہم شکر یہ ادا کر کے ہوٹل جانے پر ہی بضد رہے۔ شعیب نے ہمیں ہوٹل چھوڑا، گھنٹے بھر کا سفر تھا۔ محبت اور عزت کے بغیر کوئی اتنا کچھ نہیں کرتا۔ مجھے یہ دونوں ہی نہیں ڈاکٹر صاحب کی بھی فیملی یاد رہے گی۔

دلی میں ہوٹل کی یہ آخری رات جو آدھی تو سفر میں گزر چکی تھی بقیہ آدھی رات نیند دور دور رہی۔ مَیں ہندوستان چھوڑ رہی تھی، ایک بار پھر۔ اس بار اپنی مرضی سے۔ پہلی بار کی رخصت میرے ذہن میں کہیں بھی نہیں تھی۔ مَیں نے ہندوستان کے پانچ شہروں میں گزارے ایک ایک لمحے کو یاد کیا، ایک ایک شخص کو یاد کیا۔ راستوں کو، دکانوں کو، ٹھیلوں کو، سڑک پر چلتے گمنام لوگوں کو۔ سائیکل رکشا والے کمزور مزدوروں کو، ساری کچی پکی عمارتوں کو، درسگاہوں کو، مدرسوں کو، عزیز واقارب کو، ہر جگہ کے اپنے میزبانوں کو، سخت گرمی کو، قبرستان کی خاموشی کو۔

صبح ہوئی اور ایک بار پھر چیک آؤٹ ہوتے ہوئے مَیں نے ہوٹل کے رجسٹر پر آخری دستخط کیے۔ ہوٹل والوں نے بھی مجھے خدا حافظ کہا۔

اسی ایئرپورٹ پر دوبارہ آئی جہاں پاکستان سے آ کر اتری تھی۔ ایئرپورٹ کا ماحول ایک جیسا ہی ہوتا ہے چاہے وہ ہیتھرو ایئرپورٹ لندن ہو۔ شینن ایئرپورٹ آئر لینڈ ہو۔ جدہ ایئرپورٹ ہو، ریاض ایئرپورٹ ہو یا دبئی ایئرپورٹ یا پھر اپنے پاکستان کا قائداعظم ایئرپورٹ۔ کچھ لوگ آ رہے ہوتے ہیں، کچھ جا رہے ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ چھوڑنے آتے ہیں کچھ استقبال کے لیے۔ کسی کے چہرے پر خوشی ہوتی ہے، ملنے کی خوشی، کسی کی آنکھیں نم ہوتی ہیں، بچھڑنے کی صورت میں۔

مَیں نے دلی ایئرپورٹ پر ویزے کی آخری کاپی تھمائی اور ایئرپورٹ پر الوداعی نظریں دوڑائیں۔

پی آئی اے کے جہاز میں بیٹھتے ہی آیت الکرسی پڑھی اور آنکھیں بند کر لیں۔ مَیں کراچی جا رہی تھی، اپنے اس شہر جسے مَیں نے اپنایا تھا اور جو، اب دنیا کے سارے شہروں سے مجھے پیارا تھا کہ جہاں مَیں نے جینا سیکھا، جہاں علم حاصل کیا اور علم بانٹا بھی۔ یہ وہ شہر ہے جہاں میرا اسکول ہے۔ جہاں میرا کالج ہے، جہاں میری یونیورسٹی ہے۔ جہاں سے مَیں نے درجہ بدرجہ بہت سے

امتحان پاس کیے۔ جہاں سے مجھے زندگی بھر کے لیے اچھے دوست ملے جن سے مَیں اپنے دکھ سکھ بانٹتی رہی ہوں۔ مجھے اچھے استاد ملے جنہوں نے مجھے علم ہی نہیں زندگی جینے کے بہت سے رموز سکھائے۔ یہاں میرے بہت سے رشتے رہتے ہیں، رہتے تھے جواب دنیا سے جا چکے ہیں۔ جن میں ایک میری اماں بھی تھیں جونئی صدی شروع ہوتے ہی کراچی شہر چھوڑ چلیں۔ ہمیں چھوڑ گئیں۔ جن کی آخری آرام گاہ پر مَیں جب چاہے جا سکتی ہوں اور جاتی ہوں۔ اس شہر میں میرا ایک چھوٹا سا گھر ہے۔ عجیب اتفاق ہے، یہ گھر بھی ایک مشہور چوک پر ہے جو تین تلوار کے نام سے مشہور ہے۔

اس گھر کا نام ''نور گھر'' ہے جو میرے بچوں کے داوا کے نام پر رکھا گیا ہے۔ میرے بچے بھی ہجرت کر گئے ہیں۔ دوسرے ملک میں تیسرے درجے کے شہری ہیں اور خوش ہیں۔ ابھی ہم اس گھر میں رہتے ہیں۔ جب ہم نہیں رہیں گے وہ تب یہاں آئیں گے۔ شاید چشمِ نم کے ساتھ میرے کمرے میں کھڑے ہو کر شاید ہمیں محسوس کریں۔ میری رائٹنگ ٹیبل پر رکھے قلم اور ڈھیر سارے مخصوص کاغذ دیکھ کر شاید ان کا دل زور زور سے دھڑکے۔ دیوار پر انکی ہماری اور اپنی بچپن کی تصویریں دیکھیں۔ شاید مسکرادیں۔ شاید رو پڑیں۔

ہاں مَیں اپنے اسی شہر اور اپنے اسی گھر کی طرف رواں تھی۔

ایئر ہوسٹس کی آواز آئی، ''سیٹ بیلٹ باندھ لیں۔ ہم روانہ ہونے والے ہیں۔'' بند آنکھیں کھول دیں۔ سوچتے ذہن سے پیچھا چھڑایا۔ ہوائی جہاز پر نظر دوڑائی۔ یہ ہماری قومی ایئر لائن کی فلائیٹ نمبر PK-272 تھی۔ جو ہمیں پہلے لاہور پھر کراچی لے کر جانے والی تھی۔ اسی کراچی شہر جو مجھے بہت عزیز ہے۔ جس کے لیے مَیں ساحر لدھیانوی کا یہ شعر اکثر گنگناتی ہوں جسے انہوں نے اپنے کالج کے لیے لکھا تھا۔ مَیں نے اسے اپنے شہر کے لیے استعمال کیا ہوا ہے۔

دورِ خزاں میں بھی تری کلیاں کھلی رہیں
تا حشر یہ حسین فضائیں بسی رہیں

□

دوسرا حصّہ

کچھ تحریریں......کچھ تصویریں

روزنامہ انقلاب میں خبر کی اشاعت

پروفیسر نوشابہ صدیقی کے اعزاز میں اے ایم یو میں استقبالیہ تقریب

پروفیسر نوشابہ صدیقی کی تحریر پڑھ کر ان کے ناول نگاری کے فن پر گرفت کا اندازہ ہوتا ہے: عقیل احمد صدیقی

علی گڑھ (اسٹاف رپورٹر) پاکستان کی معروف ناول نگار پروفیسر نوشابہ صدیقی کی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی آمد پر ایک استقبالیہ تقریب کا انعقاد کیا گیا جس کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اپنے ماضی سے رشتہ قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اپنے حال کو سمجھا جائے انھوں نے اپنے والد حسن عبداللہ حسن کا شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی سے تعلق بیان کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے یونیورسٹی کی مختلف تقاریب کے موقع پر نظمیں لکھیں جو کہ تاریخ وار مرتب کی گئی ہیں اس طرح یہ کتاب تاریخ کا ماخذ قرار دی جا سکتی ہے اور اپنی کتاب "افکار حسن" کا مضمون زیر لب بھی پیش کیا۔ پروفیسر نوشابہ نے بتایا کہ جب وہ دو سال کی تھیں تب ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ انھوں نے رشید احمد صدیقی کے مضامین کے ذریعہ اپنے والد کی بازیافت کی اور ان کے کلام کو شائع کرایا۔ شعبۂ اُردو کے استاد و ماہنامہ تہذیب



معروف ناول نگار پروفیسر نوشابہ صدیقی کے اعزاز میں منعقد تقریب کا منظر (تصویر: انقلاب)

الاخلاق کے مدیر پروفیسر صغیر افراہیم نے پروفیسر نوشابہ صدیقی کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کے دو ناول "صلیب کے زخم" (۱۹۷۳) زندگی بھر کی بات (۲۰۱۰) شائع ہو کر مقبول عام ہو چکے ہیں، انھوں نے اپنے والد اور دادی کی ادبی تخلیقات کو بھی مرتب کیا ہے۔ نوشابہ صدیقی نے لکھنے کی شروعات اخبار جنگ سے کی تھی اور وہ اخبار جہاں کے پہلے پرچے کی مدیر تھیں جو مسلسل چالیس سال سے اپنی خدمات دے رہا ہے۔

صدر شعبۂ اُردو پروفیسر عقیل احمد صدیقی نے اظہار تشکر پیش کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر نوشابہ صدیقی کی جو تحریر سنی گئی اس سے ان کے ناول نگاری کے فن پر گرفت کا اندازہ ہوتا ہے، انھوں نے خود کلامی کے انداز میں اپنے تخیل کا ایسا استعمال کیا ہے کہ یہاں ایک طلسم طاری ہو گیا ہے۔ استقبالیہ تقریب میں شعبۂ اُردو کے سابق صدر پروفیسر محمد زاہد، پروفیسر جمال حسین، پروفیسر طارق چھتاری، ڈاکٹر سیما صغیر، ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی کے ساتھ ریسرچ اسکالر محمد فرقان سنبھلی، محمد سلمان، محمد شاہد، اکرم وارث، عبدالرحمن، محمد معروف، ضمیر اللہ، کیف فرشوری، محمد فرحان، نیہا اقبال، فوزیہ موجود تھیں۔ نظامت کے فرائض پروفیسر صغیر افراہیم نے انجام دیئے۔

روزنامہ سہارا دہلی کی خبر

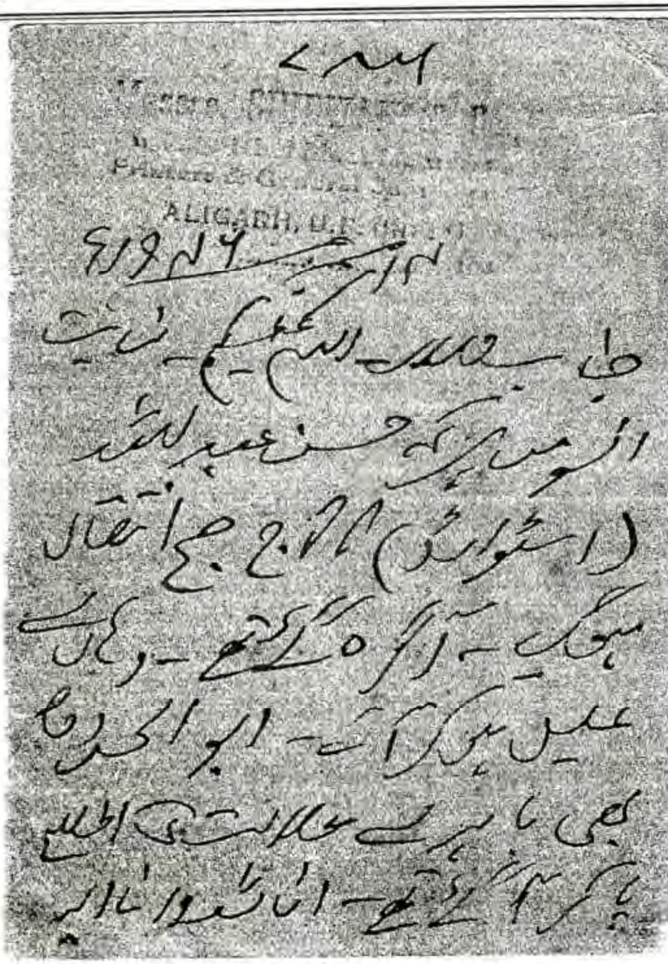
پاکستانی پروفیسر کی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی آمد پر استقبالیہ



علی گڑھ: پاکستان کی ناول نگار پروفیسر نوشابہ صدیقی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں خطاب کرتے ہوئے.......................(تصویر: ایس این بی)

علی گڑھ (ایس این بی)

پاکستان کی معروف ناول نگار پروفیسر نوشابہ صدیقی کی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی آمد پر ایک استقبالیہ تقریب کا انعقاد کیا گیا جس کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اپنے ماضی سے رشتہ قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اپنے حال کو سمجھا جائے۔ انھوں نے اپنے والد حسن عبداللہ حسن کا شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی سے تعلق بیان کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے یونیورسٹی کی مختلف تقاریب کے موقع پر نظمیں لکھیں جو کہ تاریخ وار مرتب کی گئی ہیں اس طرح یہ کتاب تاریخ کا ماخذ قرار دی جا سکتی ہے۔ اور اپنی کتاب "افکارِ حسن" کا مضمون زیر لب بھی پیش کیا۔ پروفیسر نوشابہ نے بتایا کہ جب وہ دو سال کی تھیں تب ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا انھوں نے رشید احمد صدیقی کے مقدمہ کے ذریعہ اپنے والد کی بازیافت کی ہے ان کے کلام کو شائع کرایا۔ شعبۂ اُردو کے استاد و ماہنامہ تہذیب الاخلاق کے مدیر پروفیسر صغیر افراہیم نے پروفیسر نوشابہ صدیقی کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کے 2 ناول "صلیب کے زخم (1973) زندگی بھری بات (2010) شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ انھوں نے اپنے والد اور دادی کی ادبی تخلیقات کو بھی مرتب کیا ہے۔ نوشابہ صدیقی نے لکھنے کی شروعات اخبار جنگ سے کی تھی اور وہ اخبار جہاں کے پہلے پرچے کی مدیر تھیں جو مسلسل چار سال سے اپنی خدمات انجام دے رہا ہے۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر عقیل احمد صدیقی نے اظہار تشکر پیش کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر نوشابہ صدیقی کی جو تحریر پیش کی گئی اس سے ان کے ناول نگاری کے فن پر گرفت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے خود کلامی کے انداز میں اپنے تخیل کا ایسا استعمال کیا ہے کہ یہاں ایک طلسم طاری ہو گیا ہے۔ استقبالیہ تقریب میں شعبۂ اُردو کے سابق صدر پروفیسر محمد زاہد، پروفیسر جمال حسین، پروفیسر طارق چھتاری، ڈاکٹر سیما صغیر، ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی کے ساتھ ریسرچ اسکالر محمد فرقان سنبھلی، محمد سلمان، محمد شاہد، اکرم وارث، عبدالرحمٰن، محمد معروف، ضمیر اللہ، کیف فرشوری، محمد فرحان، نیا اقبال، فوزیہ موجود تھیں نظامت کے فرائض پروفیسر صغیر افراہیم نے انجام دیے۔


ALIGARH, U.P.

السلام علیکم۔ نہایت افسوس ہے کہ

(اسٹرابری) آج صبح انتقال

ہو گیا ہے۔ آگرہ گئے تھے۔

علیل ہو کر آئے۔

انا للہ و انا الیہ

یہ وہ پوسٹ کارڈ ہے جو میرے ابا کے انتقال کی خبر دیتے ہوئے نواب مقتدا خان شیروانی نے صدر یار جنگ نواب حبیب الرحمٰن شیروانی کو لکھا جو آج تک موجود ہے۔ اور مہر الٰہی ندیم صاحب نے مجھے دکھایا۔

شاید یہ پوسٹ کارڈ میرے علی گڑھ آنے کا انتظار کر رہا تھا۔



Dr. M. K. Rawat
M.Sc., Ph.D.
PRINCIPAL
AGRA COLLEGE, AGRA

Office : 0562-2268553
09219445237
Fax : 0562-2460486
Mobile : 09412271808

Dated: 24.05.2014

CERTIFICATE

This is to certify that **Prof. Naushaba Siddhiqui** visited Agra College, Agra today and she has gifted a collection of poetry of her father Prof. Hasan Abdullah, who had been Prof. of Urdu and Persian in Agra College, Agra during 1940 to 1946.

The undersigned have assured her that college will try its best to trace out the informations about Prof. Hasan Abdullah from old college records.

My best wishes to her with gratitude.

24/05/14
(Dr. M.K. RAWAT)
Principal
Agra College, Agra

Website : agracollegeagra.com, E-mail : principalagracollege@gmail.com

ST. JOHN'S COLLEGE, AGRA

ESTABLISHED IN 1850

(STATUS OF A COLLEGE WITH POTENTIAL FOR EXCELLENCE CONFERRED BY UGC)

Prof. Alexander Lall
M.Sc., Ph.D. (Agra), F.E.S.I., F.S.B.
P.G. Saarland (Germany)
Principal

Off.: 91-0562-3247846
website: www.sjcagra.in

Date 24. May 2014

It was a blissful experience for me to have met Prof. Naushaba Siddiqui of Karachi University Pakistan. who specifically visited India to relive and personally experience those unseen moments which her honorable father Late Prof. Hasan Abdullah had spent in St. John's College, Agra.

Prof Hasan Abdullah was a Professor of Urdu & Persian language in the college from 1941 to 1946.

Prof. Siddiqui had done a wonderful & highly commendable work by compiling the nostalgic memories of her Late father Prof. Hasan Abdullah.

I'm sure her kind visit to St. John's College, Agra would definitely leave an indelible mark on her emotional & wonderful attachment for her father. I wish her fond memories & safe stay in Agra.

[signature] 24.5.2014

PRINCIPAL
St. JOHN'S COLLEGE
AGRA

وہ فارم جو میرے ابا حسن عبداللہ نے **Ph.D** کرنے کے لیے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز، لندن میں پُر کیا تھا۔ میرے بیٹے اشعر نور نے جو ریاض، سعودی عرب میں مقیم ہے، بہ مشکل حاصل کیا کہ ان کے ملک کے قانون کے مطابق **85** سال بعد حاصل کیا جاسکتا ہے، اور ابھی صرف **66** سال گزرے ہیں۔

اس فارم کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں پی ایچ ڈی کا موضوع:

"The Golden Age of Urdu Prose(1832-1900)"

درج ہے جس کا علم ہمیں نہیں تھا۔

... STUDIES
(UNIVERSITY OF LONDON)
VANDON STREET, S.W.1.

1939-40.
1st TERM
2nd TERM
3rd TERM

In Indian Correspondence

FORM OF APPLICATION FOR ADMISSION.

Surname (in block letters) ABDULLA Title, Honours, &c.

Other Names Hasan

Address while attending School 7. The Drive, Golders Green. N.W. 11.

Telephone No.

Home Address (if not as above) P.O. & V., Pakhtia Dist Ghazipur, U.P. India

Telephone No.

Nationality Indian Date of Birth 2 Jan. 1905.

Schools (with dates)

Honours, Examinations passed, &c.

University or Universities (with dates) Aligarh Muslim Univ. 1936-38

Degrees and other Distinctions M.A. (Aligarh)

Present Occupation (if any) Vernacular

[illegible] URDU

[illegible]: "The Golden Age of Urdu Prose (1832-1900)".

Purpose of Study Ph.D. Degree

PREVIOUSLY ATTENDED IN 19.3 39.

Country of Destination

Names and Addresses of two referees to whom you are personally known:

Who is ultimately responsible for the payment of fees?

To whom and where must accounts for fees be sent?

If you are in receipt of a scholarship, exhibition or other award, give details:

For *all* University Students, and other persons not over 21 years of age:

Name of Parent or Guardian

Address of Parent or Guardian

Occupation

DECLARATION OF ADHESION TO REGULATIONS.

I, the undersigned, do hereby engage that I will conform to such regulations as have been or may be made for the maintenance of order in the School and in the Classes which I attend.

Date *Signed*



SCHOOL OF ORIENTAL STUDIES
(UNIVERSITY OF LONDON),
VANDON STREET, S.W.1.

1938-39.
1st TERM
2nd TERM
3rd TERM

FORM OF APPLICATION FOR ADMISSION.

Surname (in block letters) Hasan Abdulla   Title, Honours, &c.

Other Names Hasan ×

Address while attending School 7, The Drive, Golder's Green N.W.11.

Telephone No. SPEedwell 7850

Home Address (if not as above) P.O. + V. PAHITIA
Distt. GHAZIPUR U.P. INDIA   Telephone No.

Nationality Indian   Date of Birth January 3, 1905

Schools (with dates) Aligarh Muslim University, Aligarh U.P. INDIA
1936 - 38

Honours, Examinations passed, &c. M.A. (URDU)

University or Universities (with dates)
Aligarh Muslim University, Aligarh U.P.

Degrees and other Distinctions M.A. (URDU)

Present Occupation (if any) None   Vernacular Urdu

[illegible] Ph.D. in Urdu
[illegible] Internal Student - Oct. 1938.

[illegible]: "The Golden Age of Urdu Prose (1832-1900)".
Purpose of Study Research

Country of Destination INDIA

Names and Addresses of two referees to whom you are personally known:
[illegible]
Indian House

Who is ultimately responsible for the payment of fees? Self

To whom and where must accounts for fees be sent? Self at [illegible]

If you are in receipt of a scholarship, exhibition or other award, give details:

For all University Students, and other persons not over 21 years of age:
Name of Parent or Guardian Alhaj, M. Abul Hasan Esqr.
Address of Parent or Guardian P.O. + V. PAHITIA,
Distt. Ghazipur U.P. INDIA.

Occupation Retired I.E.S.

DECLARATION OF ADHESION TO REGULATIONS.

I, the undersigned, do hereby engage that I will conform to such regulations as have been or may be made for the maintenance of order in the School and in the Classes which I attend.

Date October 2, 1938   Signed Hasan Ali [illegible]

...OOL OF ORIENTAL & AFRICAN STUDIES

No. 3535

UNIVERSITY OF LONDON

1940-41.

1st. TERM
2nd. TERM
3rd TERM

FORM OF APPLICATION FOR ADMISSION.

...name ABDULLA

...r Names Hasan Title, Honours, &c.

...ess while attending School c/o Shah ... ... Esq.
Advocate, ...

...e Address (if not as above) Telephone No.

Telephone No.

...onality Indian Date of Birth 3 Jan. 1905

...ools (with dates)

...s, Examinations passed, &c.

...ity or Universities (with dates) Aligarh Muslim Univ. 1936-38

...s and other Distinctions M. A. (Aligarh).

...t Occupation (if any) Vernacular

... URDU

...sis:- "The Golden Age of Urdu Prose (1832-1900)"

...e of Study Ph. D. Degree

PREVIOUSLY ATTENDED IN 1938/9/40

...ry of Destination

...s and Addresses of two referees to whom you are personally known:

...o is ultimately responsible for the payment of fees?

...om and where must accounts for fees be sent?

...you are in receipt of a scholarship, exhibition or other award, give details:

...r University Students, and other persons not over 21 years of age:

...Name of Parent or Guardian

...Address of Parent or Guardian

Occupation

DECLARATION OF ADHESION TO REGULATIONS.

I, the undersigned, do hereby engage that I will conform to such ...ulations as have been or may be made for the maintenance of order in the School and in the Classes which I attend.

Signed

...

تصویریں نظر کی تحریریں ہوتی ہیں۔

اِس سفر کی چند تصاویر



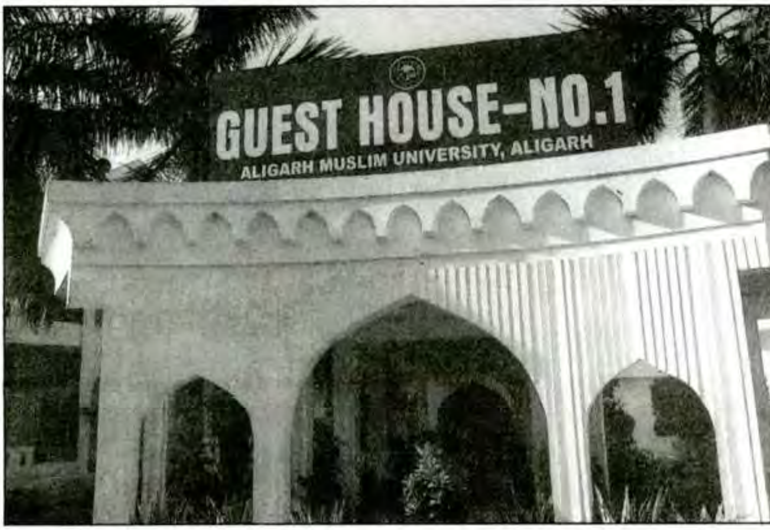
پروفیسر صغیرافراہیم، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جریدے ماہنامہ ''تہذیب الاخلاق'' کے دفتر میں
کتاب ''افکارِ حسن'' کے ساتھ



''تہذیب الاخلاق'' کے دفتر کے باہر



سرسیّد ہال میں پروفیسر صغیر افراہیم کے ساتھ



یونی ورسٹی گیسٹ ہاؤس جہاں ہم نے تین راتیں بسر کیں



مہر الٰہی ندیم جنہوں نے پوسٹ کارڈ
اور دادا کے خطوط کی نقل فراہم کی



مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے بیرونی دروازے پر



جہاں میرے ابا کے انتقال کی خبر دینے والا اخبار موجود ہے



سرسیّد ہال جہاں ماریسن کی تصویر
آویزاں ہے۔اس کے ہاتھ کی
تحریریں میرے پاس موجود ہیں



علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے چانسلر صاحبان کی تصاویر



حبیب منزل میں نواب ریاض الرحمٰن شیروانی اور پروفیسر صغیر افراہیم کے ساتھ۔
یہ ایک پوتے اور پوتی کی ملاقات تھی تقریباً ایک صدی کے بعد



حکیم ظل الرحمٰن کے ساتھ ابنِ سینا اکیڈمی میں



شریف فیملی اور حکیم اجمل خان فیملی کی نامور شخصیات کی تصاویر



ابا کی قبر پالینے کے بعد چشمِ نم کے ساتھ



کتاب ''افکارِ حسن'' پہنچانے کی آرزو پوری ہوئی



صفائی اور کتبے پر رنگ کے بعد



آگرہ کالج کے گیٹ پر



آگرہ کالج کے اندر



پرنسپل پروفیسر راوت کے ساتھ۔ کتاب ''افکارِ حسن'' پیش کرتے ہوئے



آرٹس فیکلٹی میں انگریزی کی پروفیسر شاداں کے ساتھ



کالج کا سب سے قدیم اور خستہ کمرہ
نمبر 8۔ ابا کے نقشِ قدم کی تلاش میں



سینٹ جانس کالج کی قدیم خوب صورت عمارت



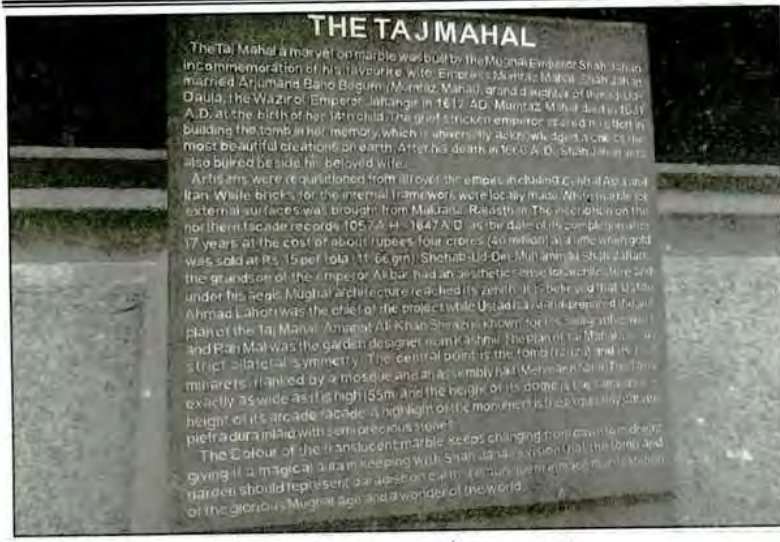
پرنسپل ال ایگزینڈر لال کی خدمت میں کتاب ''افکارِ حسن'' پیش کرتے ہوئے



وہ ٹکٹ جو بیرونِ ملک سے آئے ہوئے لوگوں کے لیے ہے



24 مئی 2014ء آگرے کے تاج محل کے سامنے پہلی بار



تاج محل کی تاریخ داخل ہونے سے پہلے بورڈ پر تحریر ہے



علی گڑھ میں مشکوٰۃ نامی گھر جو ہماری زمین پر تعمیر ہے۔
ساتھ میں سعید بھائی اور حامدہ آپا



حامدہ آپا کے ساتھ اپنی ہی زمین پر تعمیر شدہ گھر میں داخل ہونے کی اجازت کے منتظر



تعلیم منزل علی گڑھ جہاں میرے سب سے بڑے بھائی کے پیدا ہونے کے بعد
اوّلین تقریب منعقد ہوئی



حُسن منزل میں چشمِ نم کے ساتھ



اپنے آبائی گھر حُسن منزل غازی پور کے مرکزی دروازے پر



ایک بار پھر حسن منزل سے رخصت ہونے پر لرزتے قدموں کے ساتھ



حسن منزل کی بالائی منزل پر ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ۔
ماموں زاد بھائی احمد اور بھانجا اعظم ساتھ ہے



شکستہ ستون، ٹوٹی الماری اور بے چھت کمرے کو بے بسی سے دیکھتے ہوئے



اپنے دادا کے زیرِ استعمال کمروں کی شکستگی دیکھتے ہوئے دل بھر آیا



حسن منزل اونچائی پر تعمیر کی گئی۔
باہر کی سڑک پر تینوں کھڑکیاں جو اُن دنوں بارجہ کہلاتی تھیں



صمد منزل کے تاریخی گھر میں عبیدالرحمٰن صدیقی کے ساتھ



عبیدالرحمٰن صدیقی اپنی کتاب ''تذکرہ مشائخِ غازی پور'' دیتے ہوئے



عبیدالرحمٰن صدیقی اپنی کتاب ''غازی پور کا ادبی پس منظر'' پیش کررہے ہیں



اختر عثمان بھائی ہار پہناتے ہوئے



عزیز غازی پوری نے استقبال کیا



رام جی کیسری نے استقبال کیا



سیف الرحمٰن عبّاد پھول پہناتے ہوئے



شاعر رئیس شاہدی نے استقبال کیا



نظر غازی پوری ہار پہناتے ہوئے



شاعر بادشاہ راہی استقبال کر رہے ہیں



نفیس عالم ہنر پھول پہناتے ہوئے



عزیزالحسن صدیقی مہتمم مدرسۂ دینیہ غازی پور کی خدمت میں
کتاب ''افکارِ حسن'' پیش کرتے ہوئے



خطبۂ صدارت
جسکو
مولوی حسن عبدالصمد صاحب
ایڈووکیٹ غازی پور
نے
مدرسہ دینیہ اسلامیہ غازیپور کے
اول جلسہ سالانہ میں
بحیثیت
صدر استقبالیہ کمیٹی
بتاریخ ۱۵ر فروری ۱۹۳۶ء
پڑھا

وہ خطبۂ صدارت جو 1936ء میں
میرے والد نے دیا، آج بھی
مدرسۂ دینیہ میں محفوظ ہے



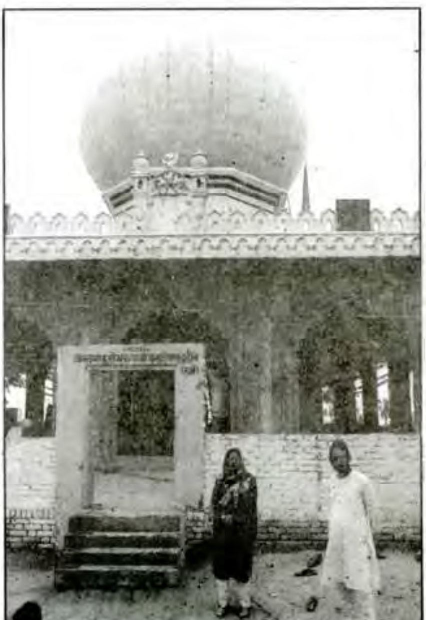
مدرسہ چشمہ رحمت کی نئی عمارت کے
سامنے جہاں میرے دادا ابوالحسن کی
خدمات کے نقش آج بھی موجود ہیں



اپنے آبائی گاؤں پہتیا کے سنگِ میل
کے ساتھ



ڈھائی سوسال پرانے کنویں بیرِ محمد علی کی
منڈیر پر



پھتیا میں داخل ہوتے ہی بزرگ کا
مزار ہے جو ہمارے آباؤاجداد میں
سے ایک تھے۔اپنے ماموں زاد بھائی
احمد ہاشمی کے ساتھ



پہتیا کی ایک آبائی حویلی میں جو شکستہ ہو چکی ہے اور چھت سے بے نیاز ہے



گاؤں والوں کے ساتھ جن میں ہندو مسلمان دونوں ہیں



ہمارے ایک عزیز درمیان میں ان کا بیٹا جس کا نام
انہوں نے ہمارے ابّا سے عقیدت کے طور پر حسن عبداللہ رکھا ہے



امّاں کا پرانا ملازم جو ہندو ہے میری
آمد پر ملنے آ گیا



امّاں کے آبائی گھر میں ان کا ایک بھتیجا
سرور ہاشمی جس کے باعث قدیم گھر آج
بھی آباد ہے



اعظم گڑھ میں ہماری میزبان
ماموں زاد بہن بلقیس



ہماری میزبان شگفتہ اعظم



دورانِ سفر ساتھ رہنے والا ہمارا بھانجا
اور بلقیس کا بیٹا اعظم



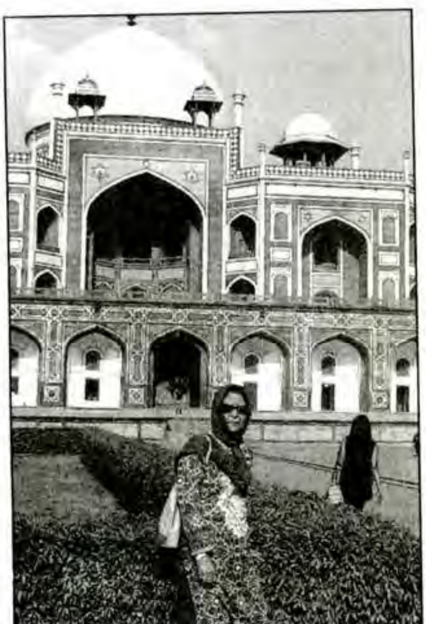
دہلی میں ہمارے میزبان
شعیب اور امینہ



بنارس سے ملنے آنے والی ہمارے
ماموں زاد بھائی عابد کی بیوی اور بچیاں
جنہیں ہم نے پہلی بار دیکھا



جامع مسجد دہلی



مقبرہ ہمایوں



دہلی یونی ورسٹی میں اپنی کتابیں صدرِ شعبہ امتیاز احمد کو پیش کرتے ہوئے۔
پروفیسر ارتضٰی کریم اور دیگر اساتذہ کے ساتھ



اردو اکیڈمی دہلی میں سیکریٹری انیس الرحمٰن اعظمی کو کتاب ''افکارِ حسن'' پیش کرتے ہوئے۔
ساتھ میں پروفیسر ارتضٰی کریم اور اکیڈمی کے دیگر اراکین



غالبؔ اکیڈمی میں غالبؔ کے ساتھ میرا ماموں زاد بھائی جاوید ہاشمی جو راجستھان سے ملنے آیا



غالبؔ انسٹی ٹیوٹ دہلی میں ڈائریکٹر رضا حیدر کے ساتھ



غالبؔ میوزیم دہلی کے سامنے



غالبؔ انسٹی ٹیوٹ میں ڈومنی کے ساتھ



غالبؔ انسٹی ٹیوٹ دہلی میں وزیٹرز بک پر دستخط کرتے ہوئے



غالبؔ کے ساتھ ایک مشاعرے میں

تیسرا حصّہ

آباؤ اجداد

کاروانِ ادب لکھنؤ سے انتخاب

مولانا سعود الحسن ندوی
استاد مدرسہ دینیہ غازی پور

مولوی محمد علی قارؔی سرولوی

مولوی محمد علی قارؔی کا وطن غازی پور ضلع کا مشہور قصبہ سرولی (پہتیا) تھا۔ وہ نسلاً صدیقی تھے۔ ان کا سلسلۂ پدری سلسلۂ نقشبندیہ کے بڑے بزرگ خواجہ عبید اللہ احرار جن کی آخری آرام گاہ سمرقند ہے، اور سلسلۂ مادری خواجہ سیّد بندہ گیسو دراز تک پہنچتا ہے۔

''سرولی'' جسے عرف عام میں پہتیا کہا جاتا ہے، کبھی بھرا پُرا قصبہ اور اہلِ علم کا مولد و مسکن تھا، جس کے تعارف میں جناب قارؔی کا یہ شعر ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے:

سرولی بود قریۂ مردم خیزے
بغازی پور اندر چوں جاں در سراپا

تاریخی حوالوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ قصبہ ضلع غازی پور کا ایک مردم خیز خطہ رہا ہے، جو خدمتِ علم و ادب کی بناء پر ممتاز تھا، مگر آج اُجڑا اُجڑا سا نظر آتا ہے۔ ماضی میں وہاں احراری خاندان آباد تھا۔ جس کے بیشتر افراد شاہی دور اور اس کے زوال کے بعد انگریزی حکومت میں بھی اہم اور ممتاز عہدوں پر فائز تھے۔ اُسی خاندان کے ایک ممتاز فرد مولوی وحید اللہ احراری تھے جو نسباً بھی احراری تھے اور مجلسِ احرارِ اسلام سے نسبت و تعلق کی بناء پر بھی احراری تھے، بے حد نڈر اور بہادر قومی کارکن تھے۔ گورنمنٹ اسکول میں ٹیچر ہوتے ہوئے بھی انگریزوں سے ہمیشہ نبرد آزما رہے۔ تحریکاتِ آزادی میں پیش پیش رہے، جیل گئے، جب ریٹائر ہوئے تو سروس بک لاپتا تھی، اسی لیے پنشن سے محروم رہے۔ مشہور قومی رہنما ڈاکٹر سیّد محمود (متوطن قصبہ بھتری ضلع غازی پور) کے

شاگرد اور پنڈت نہرو اور عبدالحمید خواجہ کے ساتھ جیل کی سزا کاٹے ہوئے تھے۔ محمد علی قارؔی بھی اسی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔

مولوی محمد علی قارؔی دینی وعصری دونوں تعلیم میں دستگاہ رکھتے تھے۔ انہوں نے سولہ سال کی عمر ہی سے نظم کہنا شروع کر دیا تھا اور احسن بلگرامی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ انہوں نے ابھی چند فارسی غزلوں پر ہی اصلاح لی تھی کہ استاذ کا انتقال ہوگیا۔ (تذکرہ شعرائے غازی پور ص 58-59)۔ قارؔی فارسی کے علاوہ اردو کے بھی قادرالکلام شاعر تھے۔ ان کا اردو کلام تو محفوظ نہیں رہا مگر فارسی (جس سے انہیں زیادہ شغف تھا) کلام کا مجموعہ ''کلیاتِ قاری'' مسمّی بہ اسم تاریخی ''اشراقاتِ دل قاری'' محمد مقتدیٰ خاں شروانی کے اہتمام میں 1349ھ مطابق 1931ء میں مطبع علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے شائع ہوا تھا۔

زیرِ نظر کتاب ''کلیاتِ قاری'' کے دیباچے میں سیّد قطب الدین صاحب فگار چشتی نیازی کی یہ تحریر پیش ہے جس سے صاحبِ کلام کا مزید تعارف ہوتا ہے:

> ''در پردہ سخن زدن از آدابِ پند و موعظت ست، وتعریض برمز و کنایت عین بلاغت، لہٰذا باقتضائے آثار متقدمین واقتدائے سلف صالحین قدوۂ اربابِ فضل وکمال گامزن براہ سعدؔی وقدم فرسا برجادۂ خسؔرو وجامؔی، قارؔی شیریں زباں حافظ معجز بیاں حضرت اوستادی برادر عم زاد من کہ نام نامی شاں حاجی مولوی حافظ محمد علی ست، وتخلص شاں قارؔی، وطنش موضع سرولی عرف پہتیاست از مضافاتِ ضلع غازی پور۔ حسب موزونی طبع فطری جواہر زواہر معانی را آب وتاب الفاظ ترکیب دادہ اند۔ دودمانش نسباً شیخ صدیقی ست، سلسلۂ پدری با خواجہ عبیداللہ احرار وسلسلۂ مادری بہ خواجہ سیّد بندہ گیسو درازی رسد۔''
>
> (کلیاتِ قارؔی ص 3 طبع شدہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی 1931ء)

مولوی محمد علی قارؔی جس طرح دینی علوم سے آراستہ تھے، اسی طرح مغربی علوم میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ مگر مغربی تہذیب سے دور تھے۔ آپ کے اعزہ دنیوی عہدے اور مناصب رکھتے تھے

مگر دینی قدروں کے بھی پاسدار تھے۔ آپ کے بھتیجے محمد یحییٰ گوالیار میں جج کے عہدے پر مامور رہے، اور صاحبزادے مولوی ابوالحسن آئی ای ایس، کشمیر میں ڈائرکٹر محکمۂ تعلیمات تھے۔ موصوف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر بھی تھے۔

''کلیاتِ قاری'' تمام تر فارسی میں ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ قاریؔ سرولوی اردو میں شعر گوئی پر قادر نہیں تھے، بلکہ فی الحقیقت ان کا اردو دیوان یا تو طبع نہیں ہوا یا محفوظ نہیں رہ سکا۔ مجموعۂ کلام کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شاعر ممدوح فارسی کے بلاشبہ ایک قادر الکلام شاعر تھے اور یہ وہبی صلاحیت انہیں اوائلِ عمری ہی سے ودیعت ہوئی تھی۔ کتاب کے دیباچے میں سیّد قطب الدین فگارؔ تحریر فرماتے ہیں:

> ''درنظم بہ عمر شانزدہ سالگی بہ ملا محمد احسن صاحب مرحوم بلگرامی تلمذ گرفتند، واصلاح محض بر چند غزل فارسی شدہ بود کہ از او استاد ہجراں گردید، ایدوں ہر آنچہ ہست بے اصلاح ست، بیشتر غزل درمشاعرہ اردو بہ تبدیل مصرع طرح بزبان فارسی غزل بہ فارسی گفتہ اند، چنانچہ مصرع طرح اردو برحاشیۂ غزل فارسی ثبت ست، و برمصرع تبدیل شدہ بفارسی خط کشیدہ شدہ تا عیاں گردد کہ چہ بود و چہ شدہ۔ درتاریخ گوئی ہم کمالے ومہارتے خاص دارند کہ در ہیچ کس شنیدہ ودیدہ نہ شد۔'' (ایضاً ص 4)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر وبیشتر قاریؔ اردو مشاعروں میں مصرع طرح کو فارسی میں تبدیل کر کے غزلیں کہتے تھے۔ ان کی متعدد غزلیں ایسی ہیں جن میں اردو کے مصرع طرح کو فارسی میں منتقل کیا گیا ہے اور حاشیہ پر اردو مصرع بھی دے دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر:

اردو مصرع طرح　　　　فارسی میں تبدیل

بلبلیں کہتی ہیں گلشن میں بہار آئی ہے
از بہاراں بہ ثنا بلبل شیدائی ہست

حسن وہ کیا ہے کہ جس کا چاہنے والا نہ ہو
چیست حسنے کز پئے آں عاشقِ جاں باز نیست

مرنے کا مزہ ہے جو مکرر نہیں ملتا
خوش ذائقۂ مرگ مکرر نتواں یافت

مَیں نے وہ پھول چنا ہے کہ گلستاں میں نہیں
آں گل اندر چمنے نیست کہ چید ستم من

شکایت آسماں کی اور زیرِ آسماں ہو کر
گلہ از آسماں داری و زیرِ آسماں باشی

یہ اشعار اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ وہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں پر پوری قدرت رکھتے تھے اور دونوں زبانوں میں شعر گوئی کی مہارت بھی رکھتے تھے۔

زیرِ نظر کتاب ''کلیاتِ قاری'' میں ''قصیدۂ نعتیہ'' کے عنوان کے تحت تقریباً 200 سے زائد اشعار درج ہیں جو عشق و محبتِ رسول ﷺ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان اشعار سے رسولِ کریم ﷺ کے ساتھ شاعر کے تعلق و محبت کا انداز ہوتا ہے۔ نعتیہ قصیدے سے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں:

شہِ دین و دنیا چہ سرکار داری
بزہکار راہم بہ زنہار داری

تلطف بصد راہ برحالِ مایاں
مدارا باعداء و کفار داری

دلِ دوستانہ ہم دلِ دشمناں را
زکیفِ مئے لطف سرشار داری

بدوعالم کجا گردن از تو بہ پیچد
کمند از دو تا زلفِ خمدار داری

شیرِ خدا سیّدنا حضرت علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ کی شانِ اقدس میں بھی منقبت کا نذرانہ پیش کیا ہے اور حضرت سعدیؔ، حضرت خسرؔو، حضرت حافظؔ، حضرت جامیؔ، حضرت خواجہ اجمیری وغیرہ کے اشعار پر خمسہ جات کا ایک وقیع اور گراں قدر مجموعہ اور رباعیات کا مجموعہ بھی شاملِ کتاب ہے۔ اور ''نالۂ دل'' کے عنوان سے جنگِ یونان میں ترکوں کی بہادری کی داستان تقریباً ڈیڑھ سو سے زائد اشعار میں یوں بیان کی ہے:

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہست
براُمت از ہر طرفے تیرِ بلا ہست

بیچارہ شد ستیم، زتو چارۂ خاہیم
یورش بسرِ مازاہالیِ جفا ہست

برما بہ ہمیں جرم کہ ایم مسلماں
دانند ستمگار کہ ہر ظلم رواست

اور پھر ایک شعر میں گویا تسلی اور صبر و برداشت اور امید و رجا کا پیغام دیتے ہوئے یوں گویا ہوتے ہیں:

قاری دلِ خود رامشکن دار قوی دل
تادم بہ تنِ ما بود امید و رجا ہست

اپنے عزیز ترین دوست محمد عمر کی وفات پر 35 اشعار پر مشتمل اپنے جذبات و احساسات پیش کئے ہیں۔ جو ''مرثیہ'' کے عنوان سے کتاب کے صفحہ 134 تا 136 پر مذکور ہیں۔ نیز سوا سو سے زائد اشعار مثنوی کے ہیں۔

حضرت قاری کوفنِ تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا۔ زیرِنظر اُن کے فارسی دیوان کا آخری حصہ تاریخ ہائے وفات سے بھرا ہوا ہے۔ زیرِ نظر مجموعۂ کلام کے صفحہ 155 پر قائم عنوان ''تواریخِ سالِ وفاتِ بزرگان وعزیزان'' کے تحت جہاں آپ نے غازی پور کے ممتاز ادباء وشعراء کی وفات پر تاریخی قطعات کہے ہیں، وہیں بشمول ان کے 24، شخصیات کے قطعاتِ وفات مذکور ہیں، جن میں سے چند قابلِ ذکر حضرات یہ ہیں: مولانا عبدالحئ انصاری لکھنوی، مولانا عبدالعلیم آسی غازی پوری، مولانا عبدالاحد شمشاؔد لکھنوی ثم غازی پوری، مولوی عبدالصمد سرولوی وغیرہ۔

جیسا کہ دیباچے میں نگاؔر نے لکھا ہے: ''قارؔی تاریخ گوئی میں کمال رکھتے تھے''۔ بطورِنمونہ ایک قطعہ پیش ہے، ملاحظہ ہو: قطعہ سالِ رحلتِ شیخ الہند حضرت مولانا محمودالحسن دیوبندی رحمتہ اللہ علیہ:

چوں اسلاف اولوالعزم کہن رفت
چہ گویم ہائے دل سوزے زمن رفت

بحالِ ہندیاں شفقت طرازے
بری از حیلہائے ما و من رفت

زکس اورا نبودہ ترس و بیمے
بہ بے باکی براہِ ذو المنن رفت

چو بلبل نغمہ زد آمد بآفاق
زبانِ شورِ ہر زاغ و زغن رفت

تنِ ہندوستاں بے جاں شدہ حیف
کہ جانِ پاک و صاف آنرا زتن رفت

رَمہ بودیم و راعی بود ذاتش
زمرگش ہر طرف گُرگِ فتن رفت

بتاریخِ وصالش گفت قارؔی
شبانِ ہند محمودالحسن رفت

❑



حسن عبداللہ حسن

حسن عبداللہ حسنؔ

جدِّ بزرگوارم حاجی حافظ مولوی محمد علی صاحب مرحوم

بہ مقام سرولی عرف پھتیا، بوقت شام، در نماز مغرب بعد ادائے فرض بہ حالتِ سجدہ، بروز
سہ شنبہ، بتاریخ 26 نومبر 1935ء
مطابق 29 شعبان 1354ھ رحلت کرد

سالِ رحلت

لفظ جدّ کے ساتھ آیت ''کُلُّ نفس'' کی حسنؔ
7 + 1928 = 1935ء
پڑھ کے مَیں نے عیسوی میں سالِ رحلت لکھ دیا
''مقرب ظلِّ یزدانی''
1354ھ
حافظ خموش
1935ء

□

حسن عبداللہ حسنؔ

اپنے دادا کے نام
قطعۂ تاریخ

بیادگار رسالِ وفات جناب حاجی حافظ محمد علی صاحب قاریؔ مرحوم ومغفور انتقال پُر ملال بتاریخ

26 نومبر 1935ء مطابق 29 شعبان 1354ھ

بمقام سرولی، ضلع غازی پور

مولوی و حاجی و حافظ محمد یا علی
فارسی میں شاعری کرتے تھے قاریؔ نام تھا

مُنصفی کے اپنے ہم عصروں میں تھے نامی وکیل
شاعری میں اُن کا ہمسر دُوسرا کوئی نہ تھا

درد کچھ ایسا اٹھا سینے میں اُن کے دفعتاً
صبح تک بے چین تھے وہ درد بڑھتا ہی گیا

نو بجے ہوں گے شبِ سہ شنبہ کو سوئے وہ جب
درد جب پیدا ہوا بارہ بجے کا وقت تھا

درد میں تخفیف وقتِ صبُح کچھ ہونے لگی
جُملہ معمولات سے فارغ ہوئے کھایا پیا

پھر بہ یک ناگاہ اُن کی سانس میں تیزی ہوئی
سانس گو جانکاہ تھی اُن کو دمہ ہرگز نہ تھا

اپنے ہاتھوں کام سب چھوٹا بڑا کرتے رہے
کُل نمازیں بھی ادا کیں عُذرِ معذوری نہ تھا

خُوش دلی کے ساتھ سب سے بولتے ہنستے رہے
کھیلتے بچوں سے تھے آرام گو پل بھر نہ تھا

ہاتھ باندھا فرضِ مغرب پڑھ کر سنّت کے لیے
سُورتِ الحمد میں سجدہ کناں سر جھک گیا

روزِ سہ شنبہ نومبر کی تھی چھبیس حیف
اے حسؔن سایہ جب اپنے سر سے اُن کا اُٹھ گیا

لفظ ''جد'' کے ساتھ آیت کُلُّ نَفسٍ کی حسؔن
1935ء
پڑھ کے مَیں نے سالِ رحلت عیسوی میں لکھ دیا

سالِ ہجری ''مقرب ظلِ یزدانی'' شُد
1354ھ
سالِ عیسوی ''حافظ خموش''
1935ء

□

حسن عبداللہ حسنؔ

یادگار کنواں

ہے کنواں یادگارِ رحم☆ اللہ
حال پر اُن کے رحم ہو اللہ

تھی محمد علی کو فکر اِس کی
اُن کے دم سے یہ یادگار رہی

بعد اُن کے ابوالحسن ذی جاہ
نیک دل نیک طینت ۔ عالی جاہ

جن سے سب خاص و عام راضی ہیں
جو زمانے کے فخرِ رازی ہیں

اُن کی خواہش ہوئی بصرفِ کثیر
ہو نئے سرے سے اِس کی پھر تعمیر

پیسہ اُن کا شعیب کی محنت
چونکہ دونوں کی نیک تھی نیت

پانی ایسا لطیف اور شیریں
کہ اِس کے اطراف میں کہیں بھی نہیں

فکرِ تاریخ عیسوی تھی حسنؔ
مَیں نہ شاعر نہ کوئی ماہرِ فن

پانی پی کر سمجھ میں آئی بات
''آستاں بوس آبِ شاخِ نبات''
1937ء

ہو تر و تازہ جس سے قلب و دماغ
سال ہجری ہے بابِ ''چشمۂ باغ''
1356ھ

ہے اِسی ایک نام سے جاری
ہاں یہ چشمہ عرب میں بیرِ علی

ایسے محسن ہمیشہ رہتے ہیں
فیضِ جاری اِسی کو کہتے ہیں

سب کے لب پر یہی ہے شام و پگاہ
یہ رہیں شاد و بامُراد اللہ

☆☆☆

☆ جدّ امجد
سرولی عرف پہتیا کا ایک یادگار کنواں جس کی تعمیر اور دیکھ بھال حاجی مولوی ابوالحسن آئی ای ایس کی مرہونِ منّت ہے۔
حافظ محمد علی دادا اور ابوالحسن والد ہیں۔ 1937ء

چوتھا حصّہ

مولانا مشکور عالم
استاد مدرسہ دینیہ، غازی پور

صمد سرولوی

مولوی عبدالصمد صمدؔ سرولوی کا وطنِ مالوف غازی پور کا مشہور قصبہ سرولی (عرفی نام پہتیا) ہے۔ آپ نے علومِ مشرقی کے علاوہ علومِ مغربی بھی امتیاز حیثیت سے حاصل کیے تھے۔ وہ نظم کے علاوہ نثر بھی لکھتے تھے۔ حضرت آسیؔ سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ وہ غازی پور کے نامور اور ممتاز وکیل اور مختلف انجمنوں اور بورڈوں کے جج بھی تھے۔ حکومتِ برطانیہ نے ان کو خان بہادر کے خطاب سے سرفراز کیا تھا مگر جذبۂ حب الوطنی نے انہیں اس اعزاز کے قبول کرنے سے باز رکھا۔

(تذکرہ شعراء غازی پور ص 45)

غازی پور کے جن دو حضرات نے ندوۃ العلماء کی تحریک کو جان و دل سے قبول کیا تھا، ان میں سے ایک یہی مولوی عبدالصمد صاحب تھے جنھوں نے 1894ء میں ندوۃ العلماء کے اغراض و مقاصد کی تائید و اعانت کے لیے ''معین الندوہ'' کے نام سے جو ماتحت مجالس ملک کے مختلف مقامات پر قائم ہوئی تھیں۔

اس کی ایک شاخ غازی پور میں بھی قائم کی تھی۔ دوسرے بزرگ موضع کٹیلا کے مولوی محمد شریف صاحب تھے جنھوں نے مہوا باغ میں ایک شاندار کوٹھی بنوا رکھی تھی جس میں وہ سکونت پذیر تھے۔

1894ء میں جب ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا تو اس کا ایک سات نفری وفد غازی پور بھی آیا، جس کا اس شہر میں شاہانہ استقبال ہوا، اور خیر مقدمی تقریب میں مولانا عبدالاحد شمشاد نے ایک نظم پڑھی جس کا آخری بند یہ تھا:

اب ہم سے سنو تھوڑے ہمارے اوصاف
ہم میں سے ہر ایک میں ہیں سارے اوصاف

ہم مجمع اوصاف نہ ہوتے تو پھر
ہرگز نہ سمجھتے تمہارے اوصاف

مولوی محمد شریف نے اپنا بنگلہ واقع مہوا باغ خالی کر کے ندوہ کو منتقل کر دیا اور ارکانِ وفد کو اپنے بنگلے پر دعوت دے کر بلایا اور کنجی ان کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ یہ حقیر ساہدیہ ندوے کی نذر کرتا ہوں۔

(تاریخ ندوۃ العلماء ج 1 ص 184)

افسوس کہ صمد سرولوی کا مطبوعہ یا غیر مطبوعہ کلام محفوظ نہیں رہا۔ اسی لیے مضطر تاج پوری مرتب ''تذکرہ شعرائے غازی پور'' نے بھی ان کا نمونہ کلام پیش نہیں کیا۔ البتہ ''خُم خانۂ جاوید'' میں لالہ سری رام نے ان کی غزل کے چند اشعار نمونے کے طور پر ذکر کیے ہیں۔ مثلاً:

منہ سے کچھ کہنے نہیں دیتی ہے بیتابیٔ دل
کیا بتائیں کہ جو پاتے تمہیں ہم کیا کرتے

آج تک ان کے سوا کچھ بھی نہیں دیکھا ہے
خواہش آنکھوں کی یہی ہے تمہیں دیکھا کرتے

اگر ان کے یہ چند اشعار بھی محفوظ نہ ہوتے تو بھی استاذ الشعراء'' آسیؔ غازی پوری'' سے شرفِ تلمذ رکھنے کی بناء پر ان کے ایک مستند شاعر ہونے میں کیا شک تھا۔ آسیؔ نے اپنی غزلیں صمد سرولوی کو دی تھیں۔ وہ جب دہلی گیے تو غالبؔ سے بھی ملے اور اپنے استاد کی غزلیں غالبؔ کو سنائیں۔ غالبؔ دم بخود سنتے رہے۔ اس کے بعد کہا: اللہ اللہ! ایسے لکھنے والے اب بھی ہندوستان میں موجود ہیں؟ صمد جس بستی کے رہنے والے تھے، اس کو یہ فخر و امتیاز حاصل تھا کہ اس کے ہر گھر میں علم کا چرچا تھا۔ بستی کا ہر بچہ پڑھا لکھا تھا۔ وکلاء کی اچھی خاصی تعداد تھی اور ہر وکیل مولوی تھا۔

شعروشاعری کا چرچا تھا۔

غازی پور کے گزیٹر کے مصنف ''ایچ آر نیول'' نے گزیٹر کی 29ویں جلد مطبوعہ 1909ء میں لکھا ہے کہ پہتیا کے صدیقیوں اور یوسف پور کے انصاریوں نے سرکارِ برطانیہ کی بڑی مدد کی، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ بعد کے زمانے میں دونوں ہی قصبات کے ان ممتاز خاندانوں نے اپنے بزرگوں کی غلطیوں کی پوری پوری تلافی کر دی۔ یوسف پور کے خاندانِ انصاری نے تو ایسے ایسے مجاہدینِ آزادی پیدا کیے جنھوں نے اپنی قربانیوں کی شاندار تاریخ رقم کی۔ حکیم عبدالوہاب انصاری نابینا، حکیم عبدالغفور انصاری، حکیم عبدالرزاق انصاری، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم محمد احسن انصاری، بیرسٹر فریدالحق انصاری وغیرہ جنگِ آزادی کے محاذ پر سینہ سپر رہے۔ علی ہذاالقیاس۔ پہتیا کی قدیم زمیندار فیملی میں مولوی عبدالصمد اور مولوی وحیداللہ احراری جیسے قومی کارکن اور جنگِ آزادی کے سورما پیدا ہوئے۔

مولوی محمد علی قارئی جو اردو اور فارسی کے بے بدل شاعر تھے، صمد کو یوں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں:

نہ تنہا دریں ملکِ ہندوستان
کہ نامش گرفت از کراں تا کراں

بہ نثر آں چناں داشت زورِ قلم
ہمہ پنجہ اش در جہاں بود کم

کمالش بہ نظم از چہ بود از نخست
تلمذ ز آسی ز بس کرد چست

مولوی عبدالصمد قانون داں ضرور تھے اور وکالت کے پیشے سے منسلک بھی تھے، مگر مزاج وکیلانہ نہیں، بلکہ خادمانہ پایا تھا۔ ملک وملت کا درد دل میں رکھتے تھے اور قومی کاموں میں پیش پیش رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی وہ ندوے کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہوئے نظر آتے ہیں تو کبھی

قوم کے نوجوانوں کو تعلیم سے وابستہ کرنے کی فکر کرتے ہیں۔

سرسیّد مرحوم سے ان کے قریبی روابط کا پتا چلتا ہے، بلکہ ایک روایت تو یہ بھی ہے کہ جب سرسیّد 1862ء میں بحیثیت صدر اعلیٰ غازی پور آئے تو ان سے کافی قریب ہوئے اور کبھی کبھی ان کے گھر بھی آیا کرتے تھے۔ چنانچہ سرسیّد کے علی گڑھ چلے جانے کے بعد یہ تعلق قائم رہا۔ مولوی عبدالصمد نے اپنی بہت ساری کتابیں اور مخطوطات علی گڑھ بھیج دیں جو مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں "شاہ فرید عالم کلکشن" میں موجود ہیں۔ سرسیّد مرحوم نے کتابوں کی وصول یابی کی رسید بھیجتے ہوئے ان کو لکھا تھا:

> "آپ کے تعاون کا دل سے ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے یاد رکھا۔ شاہ اسد علی کے ساتھ رام پور میں ملاقات گو کہ بہت مختصر تھی۔ کبھی دہلی جانا ہو تو علی گڑھ بھی ضرور آیئے اور میرے مہمان رہئے۔ آپ کی ارسال کردہ تمام کتابیں اور تین عدد قلمی نسخے بھی شاہ فرید عالم صاحب (محلّہ میاں پورہ) نے عطا فرمائے۔"

یہ اس دور کی باتیں ہیں جب غازی پور صحیح معنوں میں مرکزِ علم و ادب تھا۔ تبھی تو ملک کے دور دراز مقامات سے اہلِ علم اور جویائے علم شدّ رحال کر کے یہاں چلے آتے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سرسیّد کیوں یہاں آتے اور سائنٹفک سوسائٹی کی داغ بیل ڈالتے۔ اکبرالٰہ آبادی کیوں اپنی خوشی سے تبادلہ کرا کے آتے۔ مولانا رحمت اللہ فرنگی محلی کیوں بار بار یہاں آنے کی زحمت اٹھاتے۔ مولانا فاروق چریا کوٹی اور مولانا عبدالاحد شمشاد کیوں اس شہر کو اپنا وطنِ ثانی بناتے اور اسی کی خاک کا پیوند بنتے۔ علامہ شبلی کیوں یہاں آ کر مولانا فاروق چریا کوٹی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرتے۔ مولانا حکیم جمیل الدین نگینوی کیوں سالہا سال یہاں قیام کرتے۔ مولانا عبدالشکور مچھلی شہری جنہیں بقول مولانا مناظر احسن گیلانی سرکارِ انگریزی کی طرف سے عزت و امتیاز اور مناصبِ جلیلہ حاصل تھے اور ان کے رفیق مولوی رحمٰن علی غازی پور آتے اور اپنے ساتھ طلبہ کی جماعت کو بھی لاتے اور بغیر کسی معاوضے کے ان کو پڑھاتے، بلکہ ان کے طعام و قیام کا بھی نظم کرتے۔ یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کیوں مدرسہ بردوش غازی پور چلے آتے۔

مولانا عبدالاحد شمشاد لکھنوی ثم غازی پوری نے 1894ء میں ندوۃ العلماء کے قیام کے بعد اس کے ایک موقر وفد کا غازی پور میں استقبال کرتے ہوئے کہا تھا:

ہم مجمعِ اوصاف نہ ہوتے تو پھر
ہرگز نہ سمجھتے تمہارے اوصاف

ظاہر ہے کہ ہم اس قسم کے دعوے تو نہیں کر سکتے اور تعلی سے بھی کام نہیں لے سکتے مگر یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ زمانے کی اصلاحی تحریکات سے ہم بڑی حد تک واقف ہی نہیں بلکہ اس سے جڑے ہوئے بھی ہیں اور امت کی صلاح وفلاح کی جو ٹوٹی پھوٹی کوششیں ہو رہی ہیں، ان میں ہمارا بھی کچھ حصہ ضرور ہے۔ ہم ان شخصیتوں کو جانتے ہی نہیں، بلکہ ان کے قدرداں بھی ہیں جو آج ملک وملت اور انسانیت کی چارہ گری میں مصروف ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو بارآور اور قبول فرمائے۔ آمین۔

(غازی پور کا ادبی پس منظر ص106)

❑

علی گڑھ یونیورسٹی کے جریدے

''تہذیب الاخلاق''، شمارہ مارچ 1999ء سے انتخاب

مولوی عبدالصمد صاحب سرولوی

مولوی عبدالصمد صاحب وکیل نے سرسیّد کی موجودگی میں اور ان کے چلے جانے کے بعد ان کی تحریک کو رواں دواں رکھا۔ غازی پور میں چاہے تعلیمی تحریک کا معاملہ ہو یا اصلاحی، سیاسی وسماجی بیداری لانے کی بات ہو، اس میں مولوی عبدالصمد صاحب کا نام سرِفہرست آتا ہے۔

مولوی عبدالصمد صاحب کا تعلق غازی پور کے موضع سرولی عرف پہتیا کے اعلیٰ زمین دار گھرانے سے تھا۔ اصلی نام عبدالصمد اور تخلص ''صمد'' تھا۔ سرولی عرف پہتیا میں 1838ء میں پیدا ہوئے۔ علومِ مشرقی کے ساتھ آپ نے علومِ مغربی بھی امتیازی حیثیت سے حاصل کئے۔ ابتدائی تعلیم سرولی کے مکتب میں لینے کے بعد غازی پور شہر کے جرمن مشن ہائی اسکول آ گئے۔ جہاں سے الہ آباد چلے گئے۔ وہاں سے قانون کی سند حاصل کی اور واپس اپنے وطن میں آ کر وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ اسی وقت سرسیّد کا تبادلہ غازی پور میں ہوا۔ صمد صاحب کی شہرت اور عزت اپنے عروج پر تھی۔ لہٰذا سرسیّد بھی ان سے مرعوب ہوئے۔ سرسیّد اس وقت جب غازی پور میں آئے تو ایک ایسے شخص کی تلاش تھی جو ان کے تعلیمی خاکے پر پورا اترتا ہو اور ان کے مشن میں اپنا بھرپور تعاون دے۔ یہ ساری خصوصیتیں انہیں عبدالصمد صاحب وکیل میں نظر آئیں۔ لہٰذا جلد ہی اجنبیت گہری دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ غازی پور کے غیر تعلیم یافتہ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے بڑے منصوبے اور ان میں شعور کی بیداری لانے کے طریقے ڈھونڈے جانے لگے۔ غازی پور کے رؤسا اور زمین داروں کے پاس جانا اور اپنی انگریزی ودینی تعلیم کی جانب ان کی نظروں کو مبذول کرانا

آسان نہ تھا لیکن عبدالصمد صاحب اور سرسیّد کے غازی پور کے رفقا مل کر بااثر اور تعلیم یافتہ خاندانوں کے افراد کو ایک پلیٹ فارم پر لانے میں کامیاب ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سرسیّد کے ذہن میں مدرسے کے سلسلے میں جو جدیدیت اور نئی تعلیم کو منظرِ عوام پر لانے کا خاکہ تھا، وہ وکٹوریہ ہائی اسکول کی شکل میں نمودار ہوا۔

مدرسہ کے چندے کے لیے سرسیّد نے سترہ ہزار روپے اہلِ غازی پور سے یکجا کیے تھے۔ اس چندے کی فراہمی کے لیے عبدالصمد صاحب وکیل پیش پیش رہے۔ ضلع کے کونے کونے میں سرسیّد کے ہمراہ گئے۔ وہاں جلسے کرتے، مدرسے کی اہمیت اور اس کی افادیت سے لوگوں کو روشناس کراتے اور زیادہ سے زیادہ چندہ دینے کے لیے لوگوں کو بیدار کرتے تھے۔

سرسیّد کے علی گڑھ چلے جانے کے بعد بھی عبدالصمد صاحب وکیل کا رشتہ قائم رہا۔ یہاں سے ان کے لیے بہت سی کتابیں اور قلمی نسخے لٹن لائبریری کے لیے بھیجی تھیں۔ کتابوں کے ملنے کا شکریہ سرسیّد احمد خان نے اپنے ایک خط میں ادا کیا جس میں انہوں نے عبدالصمد صاحب وکیل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا کہ:

> ''آپ کے تعاون کے بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے یاد رکھا۔ شاہ اسد علی صاحب کے ساتھ رام پور میں ملاقات بہت مختصر رہی۔ کبھی دلّی جانا ہو تو علی گڑھ بھی آیئے۔ آپ میرے مہمان رہیں گے۔ آپ کی بھیجی ہوئی ساری کتابیں اور تین عدد قلمی نسخے بھی شاہ فرید عالم صاحب نے دیئے ہیں۔''

سرسیّد کے انتقال کے بعد علی گڑھ سے ایک وفد محسن الملک سیّد مہدی علی خاں کی سرکردگی میں ''سرسیّد احمد میموریل فنڈ'' کے لیے غازی پور آیا تھا۔ اس وفد کا خیر مقدم کرتے ہوئے مولوی عبدالصمد صاحب وکیل نے اپنے دولت کدہ ''صمد منزل محلّہ مچھرہٹہ'' متصل ٹی مسجد میں ایک شاندار جلسے کا انتظام کیا۔ اس میں ضلع انتظامیہ کے انگریز افسران کے علاوہ دیسی افسران اور مقامی رئیس و زمیندار و اہلِ شہر کے لوگ موجود تھے۔ اس جلسے میں نواب محسن الملک سیّد مہدی علی خاں

وفد کے ہمراہ تشریف لائے تھے۔ انہوں نے وفد کے آنے کے اغراض ومقاصد اہلِ جلسہ کو بتائے۔ مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور کے صدر مدرس حضرت مولانا شمشاد صاحب لکھنوی نے وفد کے آنے کے اعزاز میں ایک سپاس نامہ ''ایک قطعہ'' کے عنوان سے جلسہ میں پڑھا تھا۔ یہ سپاس نامہ ''دیوانِ شمشاد'' میں صفحہ 132 پر شائع ہوا ہے۔ قارئین کی دلچسپی اور عبدالصمد صاحب وکیل کا سرسیّد کی تحریک سے والہانہ لگاؤ کو مدنظر رکھ کر حاضرِ خدمت کرتا ہوں۔

مژدہ اے قوم تیری غربت کو
اب سمجھنے لگے ہیں ذی ادراک

طعنوں سے اب تجھے نجات ملی
طعنہ زن آپ ہی ہیں خجلت ناک

تجھ کو حاصل ہے درود و عروج
حسبِ خواہش ہے گردش

اِک خدائی ہے خیر خواہ تیری
کیوں نہ بدخواہ ہوں گریباں چاک

اُڑ گئے صاف ایک جھونکے میں
اعتراضوں کے نسب ہیں خس و خاشاک

پھوٹ کا تجھ میں اب تو نام نہیں
اِک دل سب ہیں مثل خوشئہ ناک

سب سمجھتے ہیں عاشق و معشوق
ایک کو دوسرے سے ہے وہ تپاک

کیا کہے گا تجھے کوئی جاہل
کون ہے تجھ سے بڑھتے اب ادراک

لبِ ساحل پہونچ جاتے ہیں
جو ہیں دریائے علم کے تیراک

کاہلی سستی تجھ سے کوسوں دور
لاکھ چالاکوں میں ہے تُو چالاک

علم کو عمرِ جاوداں تجھ سے
جہل ہے فرطِ غم سے رو بہ ہلاک

تیری جولان فکرِ عالی سے
منھ میں دشمن کے سینکڑوں من خاک

جو لگائے نفاق کی تہمت
اس سے بڑھ کر نہیں کوئی سفاک

جمع ہیں وہ علوم کے سامان
دنگ ہے جن کو دیکھ کر ادراک

مرثیہ پڑھتے تھے جو روز تیرا
اب وہ ہیں اپنے فعل پر غمناک

تیرے دشمن تھے جتنے دوست نما
کچھ نہیں کہتے منھ سے اب بیباک

صرف کہنے میں اور کرنے میں
فرقِ مبین سمجھتے ہیں چالاک

جو کہے منھ سے کر دکھائے اسے
محسن الملک کی طرح بے باک

جن سے واقف ہیں سب صغیر و کبیر
جن کی شہرت سمک سے تا بہ سماک

باندھ کر یونیورسٹی کی دھن
پھرتے ہیں شہر شہر فرحت ناک

اے خوشا بخت شہر غازی پور
کہ ہے یہ بھی مقامِ استدراک

آج خوش ہو گی روحِ سرسیّد
اپنے پیارے سے دیکھ کر یہ تپاک

سعیِ عبدالصمد کا ہے یہ اثر
جمع ہیں اس جگہ جو خوش پوشاک

ان میں ہیں چند ایسے بھی باذل
دیں جو حاتم کو طعنۂ امساک

چاہیں تو کر دیں دم میں مفلس کو
صاحبِ جاہ صاحبِ املاک

کیا عجب ہے کہ اپنی ہمت سے
اپنی شہرت کی یہ بٹھا دیں دھاک

ایسے ایسے جب اس کے حامی ہیں
اب نہیں قوم کو کسی سے باک

تم بھی شمشاد اب دعا اسے دو
خصم کو زہر دوست کو تریاک

ناتوان گفت زہر را رقاص
تاتوان گفت غنچہ را ضحاک

رقص عیش تو باد گردش چرخ
گور خصم تو بادہ خندۂ خاک

مولوی عبدالصمد صاحب وکیل کے نام سرسیّد کے بہت سے خطوط تھے جو انہوں نے اپنے لڑکے بیرسٹر یحیٰی صاحب کو لندن بھیج دیئے جو انڈیا آفس میں موجود ہیں۔ اگر وہ موصول ہو جائیں گے تو انشاء اللہ انہیں بھی عبدالصمد صاحب کے نام سے شائع کرانے کا ارادہ ہے۔

مولوی عبدالصمد صاحب وکیل تعلیمی تحریک کے روح رواں ہونے کے علاوہ جب ''ندوۃ العلما'' کی شاخیں ہندوستان میں پڑ رہی تھیں تو اس کی ایک شاخ ''معین الندوہ'' آپ ہی کی سعی و کوشش سے غازی پور میں پڑی تھی۔ ''شمعِ آزادی کے پروانے'' میں مولوی عزیز الحسن صدیقی صفحہ 61 پر لکھتے ہیں۔

''مولوی عبدالصمد صاحب ندوۃ العلما کی تحریک سے وابستہ تھے۔ 1894ء میں جب ندوۃ العلما کے مقاصد کی تائید کے لیے معین الندوۃ کے نام سے ماتحت مجالس ہندوستان کے مختلف مقامات پر قائم ہوئیں تو اس کی ایک شاخ غازی پور میں بھی قائم ہوئی تھی۔ یہ شاخ انہی کی تحریک وتائید سے قائم ہوئی تھی۔''

مولوی عبدالصمد صاحب وکیل غازی پور کے میونسپل بورڈ کے ممبر اور بعد میں چیئرمین مقرر ہوئے۔ اس کے علاوہ صوبہ اتر پردیش کی مختلف انجمنوں اور بورڈوں کے ممبر بھی رہے۔ آپ کی کارکردگی کو سراہتے ہوئے انگریزی سرکار نے ''خان بہادر'' کے خطاب سے سرفراز کیا تھا جسے بعد میں حب الوطنی سے سرشار ہو کر حکومت کو اپنا خطاب واپس کر دیا تھا۔ اس بات کا تذکرہ ''شمعِ آزادی کے پروانے'' مصنفہ مولوی عزیز الحسن صدیقی اور ''تذکرہ شعرائے غازی پور'' کے مصنف علی شیر مضطر تاجپوری نے صفحہ 45 پر کیا ہے۔

تذکرہ شعرائے غازی پور میں ہے:

''آپ بہت ہی نامور اور ممتاز وکیل تھے۔ سرکار نے آپ کو خان بہادر کے خطاب سے سرفراز کیا تھا، لیکن حب الوطنی کے باعث آپ نے قبول نہیں کیا۔''

''شمعِ آزادی کے پروانے'' میں ہے:

''حکومتِ برطانیہ نے آپ کو خان بہادر کا خطاب دیا تھا جس کو آپ نے جذبۂ حب الوطنی کے منافی سمجھا اور واپس کر دیا۔''

عبدالصمد صاحب وکیل کو شعر و شاعری سے بھی لگاؤ رہا ہے۔ آپ اپنے وقت کے پایہ کے شاعر تھے۔ غزل و نظم کے علاوہ نثر بھی خوب لکھتے تھے۔ افسوس کہ ان کا غیر مطبوعہ دیوان تقسیمِ ہند کے وقت ضائع ہو گیا اور جو کچھ بچا بھی اسے ان کے لڑکے بیرسٹر یحییٰ صاحب اپنے ہمراہ برطانیہ لیتے چلے گئے۔ صرف آپ کی غزل کا ایک شعر ملا ہے جو حسبِ ذیل ہے:

وہ دن مزے کے تھے کہ راتوں کو صبح تک
مَیں تھا تری جناب تھی دستِ سوال تھا

آپ کو محمد عبدالعلیم صاحب المتخلص بہ آسی غازی پوری سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ شاہد علی رشیدی سبز پوش گورکھ پوری ''سوانح حضرت آسی غازی پور'' کے صفحہ 19 پر لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا آسیؒ کے تلامذہ کی تعداد کثیر تھی جن میں مولوی عبدالاحد صاحب شمشاد لکھنوی، مولوی عبدالصمد صاحب رئیس وکیل غازی پوری، حکیم مولوی سیّد محمد غازی پور، مولوی احمد حسین لبیب سکندر پوری بہت ممتاز تھے۔''

مرزا اسد اللہ خان غالبؔ سے مولوی عبدالصمد صاحب وکیل کے اچھے مراسم تھے۔ آپ جب بھی دہلی جاتے تو مرزا غالبؔ سے ضرور ملتے۔ کبھی اپنی شاعری کے سلسلے میں مشورہ کرتے تو کبھی اپنے استاد حضرت آسی غازی پوری کی غزلوں کو دکھاتے۔ مرزا غالبؔ نے ایک بار حضرت آسی غازی پوری کی ایک غزل دیکھی تو یقین نہیں ہوا کہ اتنی شستہ اور پختہ غزل انہی کی ہے۔

بڑا تعجب ہوا اور حضرت آسی غازی پوری کی معیاری شاعری پر عش عش کیا۔ یہ واقعہ ''دیوانِ آسی'' میں درج ہے۔ حضرت آسی غازی پوری ؒ کے ''دیوانِ آسی'' میں شاہد علی سبز پوش نے صفحہ 37 پر لکھا ہے:

> ''حضرت آسی غازی پوریؒ نے اپنی چند نکالی ہوئی غزلیں مولوی عبدالصمد صاحب کو دے دی تھیں۔ مولوی صاحب خود دہلی گئے تھے تو غالبؔ سے ملے اور وہ غزلیں سنائیں۔ غالب دم بخود سنتے رہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ ''اللہ اللہ! ایسے لکھنے والے اب بھی ہندوستان میں موجود ہیں۔''

بے پناہ محنت، مشغولیت اور سفر کی کثرت کے سبب 25 مارچ 1903ء کو مولوی عبدالصمد صاحب وکیل پر فالج کا اثر ہوا۔ حکیم جمیل الدین صاحب مرحوم نے آپ کا علاج بڑی دل جمعی سے کیا لیکن ٹھیک نہ ہو سکے۔ آخر کار 25 جون 1903ء کو انتقال ہوگیا۔ آپ کے انتقال پر محمد علی قاری سرولوی نے اپنے مجموعۂ کلام ''کلیاتِ قاری'' کے صفحہ 175 تا 178 پر ''مرثیہ مولوی عبدالصمد'' کے عنوان سے درج کیا ہے:

(1903ء)

مرثیہ مولوی عبدالصمد بہ پنجاہ و پنج ابیات ہم عدد سن اجل اور از محمد علی قاری برادر کہیں آسودۂ علمیں۔

□

نوٹ

(مجھے یہ تحریر فوٹو کاپی کی صورت میں دی گئی
جو ایک مجلد رجسٹر کے صفحہ نمبر 281 کی ہے)

محمد عبدالصمد، رئیس و وکیل عدالت، آنریری مجسٹریٹ و وائس چیئر مین میونسپل بورڈ، غازی پور
محمد عبدالصمد پہتیا ضلع غازی پور کے رئیس تھے۔ محمڈن اینگلو اورئینٹل کالج میں احاطہ کی جنوبی دیوار ظہور حسین گیٹ کے مشرق میں ایک جالی پر ان کا نام لکھا ہوا ہے۔

9 مارچ 1877ء کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں سرسیّد نے ان کا نام شائع کیا۔ محمد عبدالصمد محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کے چوتھے سالانہ اجلاس کے جو کہ علی گڑھ میں دسمبر 1889ء میں ہوا، ممبر تھے اور انہوں نے زرِ چندہ دس روپیہ دیا جبکہ محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کی ممبری کا چندہ پانچ روپے تھا۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا ساتواں سالانہ اجلاس دسمبر 1892ء میں دہلی میں ہوا۔ اس میں کانفرنس کے مقاصد کو فروغ دینے کے لیے کارسپانڈنگ ممبر بنانے کا فیصلہ ہوا۔ یہ ممبر صوبہ پنجاب، بہار، شمال مغرب اور اودھ کے ہر ضلع میں بنائے جائیں گے۔ محمد عبدالصمد کو غازی پور کے لیے کانفرنس کا کارسپانڈنگ ممبر بنایا گیا۔

(ماخذ۔ احاطہ کی جنوبی دیوار۔ گزٹ
مورخہ 9 مارچ 1877ء صفحہ 157-58،
چوتھی ایجوکیشنل کانفرنس صفحہ 20 ساتویں
ایجوکیشنل کانفرنس صفحہ 170-75)

مرثیہ مولوی عبد الصمد بہ پنجاہ و پنج ابیات ہم عددِ سنِ اجلِ او

سنہ ۱۹۰۳ء

از محمد علی قاری برادرِ کہین آن آسودۂ علیین

سنہ ۱۳۱۰ فصلی

جہان تیرہ و تار از بہرِ چیست — زمانہ پر اندوہ از دردِ کیست
زمین از چہ غلطید بر خاکِ غم — زد آتش با فلاک برقِ الم
اگر روز ہست آن ز شب بد ترست — دگر شب ز انجم بدل اخگر ست
نہ در تن توان و نہ در دل سکون — روان ست از دیدہا جوے خون
نشانے نماندہ ز سور و سرور — فغانہا رسیدہ ز نزدیک و دور
بگیتی نماند آہ عبد الصمد — ملک خو فلک جاہ عبد الصمد
کمال و شرف را بدو ناز ہا — نوال و کرم را بدو سازہا

۱۰۶

بہر انجمن صدرِ فرماں روا — بہر گل زمیں بلبلِ خوش نوا
بسا در دلش ذوقِ سیر و سفر — بصد جاہ و مکنت بصد کر و فر
بہر گوشۂ ہند آوازہ اش — کہ راندہ بہر سمت جمازہ اش
نہ تنہا دریں ملک ہندوستاں — کہ نامش گرفت از کراں تا کراں
بہ نثر آں چناں داشت زورِ قلم — کہ ہم پنجہ اش در جہاں بود کم
کمالش بہ نظم ارچہ بود از نخست — تلمذ بہ آسی ز بس کرد چست
مگر گفتہ اش را نیاندوختہ — ز آموزگار ایں ہم آموختہ
نہ مانند ہر کس وکالت نمود — بصد سروری و جلالت نمود
بہر بورڈ بودہ بہ دو ممبری — بہ پنج آمد از بہرِ افسری
زوالیس چیر مینی امرش بلند — بہ درباریاں عمدۂ ارجمند
نہ خانِ بہادر خطابش رسید — بجاں باختن انتخابش رسید
ز حکام تا عامیٔ سوگوار — ہمہ را بہر کار حاجت برآر
بہ پیشش کمین و مہین سرنگوں — مگر خویشتن را ندیدہ فزوں
چہ اسلامیان و چہ ہندو کساں — ہمہ گوش بودند و بود او زباں
چناں داشتہ سروریِ ہمہ — کہ او ہمچو راعی ہمہ چوں رمہ
بلطف و کرم فرقِ ملت نداشت — کہ انعامِ او عام و علت نداشت
تلطف باحباب و یاراں مدام — مدارا با عدائے بدیں تمام
دو کس را اگر جنگ بودے دراز — کشادے براہا درِ صلح باز
مگر فرد خواہاں نگشتے بداں — عزیزاں یکے دیدو بہاں فلاں

۱۷۷

زمانہ گرفتش بسے آزموں — فریبے نخوردہ ز دنیاے دوں
غیوریش اورا ہمی داشت سیر — نیاورد دستش ز بالا بہ زیر
شدہ از مہ مارچ چوں بست و پنج — زفالج شدہ امینش رنج سنج
مگر زود گشتہ علاجِ جمیل[1] — پس اندازیِ رنج اورا کفیل
زباں شد بقابو و دستش بکار — بر فتار شد پاش ہم استوار
بنومیدی اُمید شد جلوہ گر — ولے آسماں باخت نردِ دگر
چو بست و سہ از جون گشت آشکار — ہموں مادّہ ریختش بر یسار
بدیں نوبت آں مایہ محکم رسید — کہ چارہ گرش باز چارہ ندید
بسے دست و پا زد بسے جہد کرد — مگر با قضا چوں شود ہم نبرد
سوم روز شد خاتمت ہائے حیف — الم بر زمانہ علَم کرد سیف
رسیدش چو پنجاہ و پنج از سنین — برید از جہاں شد بخلد بریں
از ینجاست اشعار پنجاہ و پنج — دریں نوحۂ سربسر درد و رنج
بہر جانب از شیون و نالہا — تو گوئی کہ عالم گرفتہ بلا
ز تعطیلِ غم رنگ دیواں شکست — کشیدند حکّام از کار دست
دویدند پیر و جواں بہرِ دید — کہ در دم نہاں ہست روے سعید
نہ اسلامیاں صرف ہم ہندواں — نہادند بر دوش نعش دواں
بہ ہمپائیِ نعش انبوہ جمع — چو پروانہا گرد تابندہ شمع
بغازی پور اول نمازش شدہ — کہ بر چرخ سوز و گدازش شدہ

---

[1] اشارہ ہست بہ حکیم جمیل الدین ۱۲

۱۷۸

پس نعش بردند سوئے وطن   سرِ ولی شد اے وائے دار المحن
نمازش دگر اندراں جائگاہ   ادا کردہ در گور کردند آہ
چہ می پرسی اے قادری خستہ حال   ز سالِ وصال در حسنِ مآل
دلم مضطرب بود و بے تاب و ہش   ز حق در دعا در رجا از سروش
کہ مصرعِ روشن ز خورشید تافت
حیاتِ ابد عیشِ جاوید یافت

۱۳۲۱ھ

غم آں مایہ و شکرِ خالق بریں   کہ بگزاشت فرزند را جانشیں
کہ یحییٰ بود نام نامیِ او   سمر در جہاں نیک نامیِ او
بہ انگلینڈ تا ہفتدہ سال بود   امیرانہ با نعر و اقبال بود
بہر بابِ او فتح باب آمدہ   بہ بیرسٹری کامیاب آمدہ
چو ماہِ نہم آمد از مقدمش   فلک بر سر انداخت کوہِ غمش
خدایش کرم گستر و یار باد
ازاں کش نباید نگہدار باد

نیاز نامہ بجناب مستطاب نواب صدر یار جنگ مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی۔ در ۱۹۲۸ء

پیشِ کسیکہ آمد مستغنی از ثنا ہا　　عرضہ دہم سلام و گویم پس از دعا ہا
کلے خواجہ یادت آمد چوں مستمندِ دیریں　　از وے فدائے لطفت صد گونہ جانِ شیریں
اے واہ یادِ بندہ را تا چہا فزودی　　خود نورِ چشم مارا پیغامبر نمودی
پیغمبرِ تو ایں ہم پیغام در رساندہ　　کاں ناظمِ یگانہ از من کلام خواندہ
کالائے ہیچ۔ نذرِ سلطاں۔ گدا چہ سازد　　بیچارہ بر بساطِ ناکارہ اش چہ نازد
اما کجاست یارا از حکم سرکشی را　　فرماں بری ز بندہ سرمایہ سرخوشی را
ز اصنافِ نظم چیزے ایدون بہ پیشت آرم　　وز لطفِ عالیِ تو اصلاح امید دارم
خورشید چوں نگاہے از مہر بر فروزد　　ذرہ برقص آید صد مایہ شکر توزد
اما ز صد ہزاراں یک شکر کے تواند　　گرچہ زبانِ حالِ خود تیز تیز راند
حالا رجا ز خواجہ ایں ہم بود رہی را　　درکارِ بندہ آرد الطافِ خسروی را
دُر ہائے بحرِ معنی کاں در خزینہ دارد　　در دامنِ دو چشم چیزے ازاں گزارد

ایں لطف دیگرے را ہم شکر ہا بگوئیم
اقبال و عمرِ خواجہ بیش از خدا بجوئیم





بیرسٹر محمد یحییٰ لندن میں

یہ تصاویر بیرسٹر محمد یحییٰ کی ہیں۔ یہ مولوی عبدالصمد کے بیٹے تھے۔لندن تعلیم کی غرض سے گئے تھے۔عبدالصمد صاحب ان کی تعلیم اور دیگر اخراجات کے لیے کثیر رقم ہندوستان سے بھیجا کرتے اپنے رئیسانہ طور طریقے اور حُسن کے باعث بہت مشہور تھے اور یحییٰ صاحب کے تعلقات اس وقت کی رائل فیملی کے ساتھ ہو گئے ان کے ہی ساتھ رہنے لگے۔اپنے حُسن کی بدولت وہاں انگریز انہیں ''پرنس یحییٰ'' کے نام سے پکارا کرتے۔

ہندوستان سے بوریوں میں بھر کر ان کے لیے کھانے پینے کی اشیاء انگلستان بھیجی جاتی تھیں جن میں گھر کے بنے ہوئے اچار، مٹھائیاں اور دیگر چیزیں بھی ہوتیں۔ وہ بارہ برس لندن میں رہے۔اکثر ان سے رابطہ بھی منقطع ہو جایا کرتا۔ان دنوں خط وکتابت یا تار ہی رابطے کا ذریعہ ہوا کرتا تھا۔

والد کی طبیعت کی خرابی کی اطلاع پا کر واپس ہندوستان آئے۔ والد کے انتقال کے بعد انگلستان چلے گئے اپنے ساتھ خصوصی دستاویزات۔مخطوطے اور وہ قیمتی خطوط جو سر سیّد احمد خان نے ان کے نام لکھے تھے لیتے گئے اور انہیں اس وقت کی انڈیا آفس لائبریری میں جمع کرا دیا۔

تحقیق کے بعد یہ بات ہمیں معلوم ہوئی اب تک علی گڑھ میں بھی اس پر کام نہیں ہوا ہے۔

امید ہے اب کوئی محقق اس پر کام ضرور کرے گا۔ یہ خطوط ایم اے او کالج کے قیام کے سلسلے میں تھے کہ سر سیّد ہر وقت مولوی عبدالصمد سے رابطے میں تھے اور دوستی کے مراسم بھی تھے۔ عبدالصمد صاحب ان کے بلاوے پر علی گڑھ بھی گئے تھے جہاں ان کا قیام مولانا شبلی کے ساتھ رہا۔

مولوی یحییٰ واپس ہندوستان آئے۔ اپنے شہر غازی پور یو پی میں کچھ عرصے پریکٹس کی بعدازاں ان کا تبادلہ گوالیار ہو گیا جہاں وہ جج مقرر ہوئے۔

صمد منزل غازی پور میں آج بھی شکستہ صورت میں موجود ہے۔ مَیں وہاں گئی کہ وہ میرے پردادا کا گھر ہے۔ جہاں میری ملاقات عبیدالرحمٰن صدیقی اوران کے والد اختر عثمان سے ہوئی جنہوں نے خوش دلی سے میرا استقبال کیا۔

عبیدالرحمٰن محقق بھی ہیں۔ ان سے مجھے بہت امید ہے کہ وہ مولوی عبدالصمد پر مزید تحقیق کریں گے اور مولوی یحییٰ بیرسٹر پر بھی ضرور کچھ تحریر کریں گے۔

مولوی عبدالصمد اوران کے حقیقی بھائی حافظ قاری محمد علی کی کوئی تصویر تو مجھے حاصل نہیں ہو پائی لیکن بڑی جستجو کے بعد مجھے بیرسٹر محمد یحییٰ کی دو نایاب اور اہم تصاویر خستہ صورت میں مل گئیں جنہیں جدید ٹیکنالوجی استعمال کر کے مَیں نے خاصا بہتر بنوالیا ہے تا کہ ان کے خدوخال واضح ہو جائیں۔ انہیں اپنی کتاب میں یوں چھاپ رہی ہوں کہ آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ ہو جائیں۔

□

پانچواں حصّہ



حاجی مولوی ابوالحسن، آئی ای ایس

(یہ تصویر کشمیر دربار میں لی گئی۔ جب وہ ریاست جموں وکشمیر میں محکمہ تعلیم کے ڈائریکٹر تھے)



مولوی ابوالحسن کی زندگی کے آخری ایام کی نایاب تصویر

نوشابہ صدیقی

وقت کا دل—مولوی ابوالحسن

گرومندر کی ڈسپنسری پر نظر پڑتے ہی دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج بھی سڑک کی جانب کھلنے والے کمرے کے اس ہلتے پردے کے پیچھے ایک بوڑھا جسم پورے عہد کو اپنی ذات میں سمیٹے خالقِ حقیقی سے لو لگائے لیٹا ہے۔ آہستہ آہستہ سانس لے رہا ہے۔ اس کے گرد چند افراد ہیں خاموش اداس۔ مَیں کبھی اس ڈسپنسری کو نظر بھر کر نہ دیکھ سکی۔ ایک لمحے کے لیے بھی یہاں ٹھہر نہیں سکی۔ مجھے وہ واقعہ یاد آ جاتا ہے جو میری زندگی کا بڑا سانحہ ہے۔ مجھے میرے دادا میاں یاد آ جاتے ہیں جنہوں نے اپنی آخری سانسیں یہیں پر لیں۔

میرے دادا میاں اپنے عہد کے بڑے بااثر شخص تھے۔ ہندوستان میں انسپکٹر آف اسکولز اور کالجز تھے۔ کشمیر اسٹیٹ میں ڈائریکٹر تعلیمات رہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں ریاضی اور سائنس کے پہلے پروفیسر تھے۔ نواب محسن الملک کے معتمد تھے جن کے ساتھیوں میں نواب مزمّل اللہ، نواب اسحاق خان، نواب وقار الملک، سیّد سلیمان اشرف جیسے لوگوں کا نام آتا ہے۔ جو ڈاکٹر ضیاء الدین کے دوست تھے۔ جنہوں نے ٹی ماریسن، مولوی سمیع اللہ، مولوی مشتاق حسین پر اپنا گہرا اثر چھوڑا تھا۔ جن کی زندگی بے شمار واقعات کا محور رہی تھی۔ جو انگریزوں کے دور میں گنتی کے اُن مسلمانوں میں تھے جن کی دھاک ہر انگریز افسر کے دل پر جمی ہوئی تھی۔ وہی شخص اپنے عہد کے تمام انسانوں سے بچھڑ کر اِس ڈسپنسری میں اپنے خاندان کے تمام افراد کے درمیان بے حس و حرکت پڑا تھا۔

زندگی کی تمام عظمتیں اس کے قدموں تلے تھیں اور وہ آسمان پر اپنی نئی دنیا کے خاکے بنا رہا تھا۔

تاریخ میں کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں بڑا بنایا جاتا ہے اور بلاشبہ بعض ہستیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو اپنی کوششوں سے اپنا نام پیدا کرتی ہیں جبکہ قدرت بعض شخصیتوں کو خود بنا سنوار کر دنیا میں بھیجتی ہے۔

مولوی ابوالحسن کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اِن ہی حالات سے دوچار ہوئے۔ وہ ایک بڑی شخصیت بنا کر اس دنیا میں بھیجے گئے اور اس کے بعد انہوں نے بھی اپنے وجود سے غفلت نہیں برتی بلکہ اپنی زندگی کو برابر سنوارتے رہے، نکھارتے رہے اور اپنی زندگی کے درمیانی دور میں اُن کا وجود ہر طرح مہک رہا تھا۔ وہ ایک ایسے چھتنار درخت بن گئے تھے جس کا سایہ بڑا گہرا اور بڑا ٹھنڈا ہوتا ہے۔ جو سرِ راہ جھومتا ہے اور ہر مسافر اُس کی گھنی چھاؤں تلے سانس لیتا ہے۔ اُن کی سانس کی ٹھنڈک اور پُرسکون چھاؤں سے پوری فضا مہک رہی تھی۔ وہ اپنی قوتوں سے ہر ایک میں توانائی بھر دینا چاہتے تھے۔ وہ اس ایمان کے ساتھ جیے کہ علم و اخلاق کی دولت لٹانے سے اور بڑھتی ہے۔ اخلاق و مروت کی تکرار سے شخصیت کا رنگ روپ اور نکھرتا ہے۔ وہ ساری زندگی علم و اخلاق کے خزانے لٹاتے رہے اور اُن کی زندگی کی آخری سانسوں تک اُن کی شخصیت میں نکھار آتا رہا۔

اُن کی زندگی کے اصول زندگی کے آخری لمحات میں بھی نہ بدل سکے۔ وہی سکون، وہی اطمینان اُن کے چہرے پر موت سے چند لمحے پہلے تک برستا رہا۔ وہ خدا سے براہِ راست لو لگائے بیٹھے تھے۔ موت کا خوف اُن کے چہرے پر دور دور تک نہ تھا۔ اپنی ضعیفی، اپنی بیماری اور اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود اُن کی باتوں میں وہی چاشنی تھی۔ اُن کی آواز میں وہی رعب تھا۔ اُن کی قوتِ حافظہ کا وہی عالم تھا۔ اپنی علمیت کا وہی پرتو تھا اور اپنی دین داری کی وہی دھن تھی جس پر وہ ساری زندگی کاربند رہے۔ باتوں میں مٹھاس اور دل آویز مسکراہٹ سے ہر ایک کا استقبال کیا۔ اپنی تکلیفوں کا جواں مردی سے مقابلہ کیا۔ اور حال پوچھنے والوں سے یہی کہتے رہے، ''اچھا ہوں''۔

حافظے سے اپنی زندگی کے اہم واقعات نہ بھلا سکے۔ اپنے دوستوں کو بسترِ مرگ پر بھی یاد کیا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کی تدفین کے واقعے کو دہراتے رہے۔ اپنے تمام دوستوں کے نام لیے۔ گویا دوستی کی عظمت اور روایت انہوں نے آخری دم تک روا رکھی۔ رشتہ داروں کے ہجوم آتے رہے۔ ہر ایک سے یوں مخاطب ہوتے جیسے اُس وقت اُسی کا اُنہیں انتظار تھا۔ دعائیں اور نیک تمنائیں بے دریغ لٹاتے رہے۔ امتحان کا زمانہ تھا۔ خاندان کے ہر طالب علم نے اُن سے اپنی اپنی کامیابی کی دعائیں لیں اور سب کامیاب ہو گئے۔

نوّے سال کے بوڑھے شخص نے ہر عمر کے انسانوں سے ویسا ہی رشتہ استوار کیا تھا جو دو ہم عمروں کا ہو سکتا ہے۔ بچے انہیں اپنا عزیز ترین دوست جانتے اور ان کے اردگرد یوں اکٹھے ہو جاتے جیسے کہ وہ کوئی مٹھائی کا ڈبہ ہوں۔

نوجوان اُن کے ساتھ مل کر ہنسی مذاق اور زندگی سے لطف اندوز ہوتے۔ زندگی کے قرینے اور ادب آداب سیکھتے۔ ادھیڑ دنیا سے ہٹ کر اُن مسائل پر گفتگو کرتے جو اُن کی عمر کا تقاضا بن چکے ہوتے۔ اور بوڑھے تو اُن کے ساتھ ہوتے ہی تھے۔ طالب علم اُن سے بہت کچھ سیکھ جاتے اور اَن پڑھ بہت کچھ سیکھنے کا شوق لے کر جدا ہوتے اور جب اُن کی عمر کا وہ ساتھی اُن کے قریب ہوتا جو اُن کا دوست ہوتا تب تو اُن کے چہرے کی دمک دیکھنے سے تعلق رکھتی۔ بابائے اردو سے وہ جی بھر کے باتیں کرتے۔ ورلڈ بینک کے شعیب صاحب جو بعد میں پاکستان کے وزیرِ خزانہ ہوئے اُن سے مل کر وہ اپنی استادی کے زمانے کو یاد کرتے۔ کشمیر روڈ پر عادل ہاؤس جا کر وہ اختر عادل سے یوں بغلگیر ہوتے کہ انہیں اپنی جوانی یاد آ جاتی۔ منظر عالم سے جنہیں ہم چچا کہتے مل کر بہت خوش ہوتے اور پاکستان کی سیاست پر گفتگو کرتے جو اُن کا شعبہ بھی نہیں تھا۔ امّاں اور ہماری تینوں پھوپھیوں کے درمیان تو وہ سب کے ابّا بن کر نہال ہو جاتے۔ پوتے، پوتیاں اور نواسے نواسیاں اُن کی جان تھے۔

اُن کی زندگی میں کتنی ہمہ گیریت تھی۔ اُن کی ذات کس قدر جامع تھی۔ خوش قسمتی اُن کا مقدّر تھی۔ کامیابیوں اور کامرانیوں نے اُن کے قدم چومے تھے۔ اُنہوں نے اپنی زندگی کی تمام مہم کو بخوبی سر کر لیا تھا۔ وہ سارے خاندان کا محور تھے۔ سب اُن کے گرد گھومتے رہنے میں فخر محسوس

کرتے تھے۔ اُنہوں نے نہ صرف اپنی زندگی کو کامیاب بنایا بلکہ نہ جانے کتنے بے سہارا لوگوں کو جینے کا قرینہ سکھایا۔ اُنہیں پڑھایا لکھایا اور یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ زندگی گزارنے کے لیے کسی اصول کا ہونا ضروری ہے۔ وہ ساری زندگی اپنے اصول نبھاتے رہے۔ وفاداری، سچائی اور ذہانت اُن کی کامیاب زندگی کے تین ستون تھے۔ عمر کے اس دور میں آ کر قصے کہانیاں سنانا ہی اُن کا مشغلہ، ضعیفی اور پھر بینائی کی کمزوری اُنہیں کوئی عملی کام نہ کرنے پر مجبور کر چکے تھے۔ مگر اُس دور میں بھی اُنہوں نے کسی سے کبھی کچھ نہ مانگا۔ خود ہی اٹھ کر لے لیتے۔ وضو کے لیے بھی پانی خود حاصل کرتے۔ روزہ نماز بھی اسی باقاعدگی سے جاری تھا۔ چلنے میں کبھی لڑکھڑا جائیں اور کوئی اُنہیں سہارا دے دے یہ کبھی نہیں ہوسکتا تھا۔ آخری عمر تک جمعے کی نماز کے لیے مسجد جانے پر اصرار کرتے۔ کوئی بچہ اُن کی رہبری کرتا۔ راستہ اس قدر پہچان گئے تھے کہ اگر کوئی کسی دوسرے راستے سے لے جاتا تو جان لیتے کہ یہ راستہ دوسرا ہے اور جھنجھلا جاتے۔ ''تم لوگ راستہ کیوں بدل لیتے ہو؟ پہلے بتاؤ اس راستے میں کیا خرابی ہے۔'' یوں چپکے چپکے مستقل مزاجی کی تربیت دیا کرتے۔ اپنے کمرے میں مخصوص کرسی پر آنکھیں بند کر کے بیٹھ جاتے۔ کوئی آہستہ سے بھی کمرے میں داخل ہو تو جان لیتے۔ اسے اپنے پاس بٹھا لیتے۔ اخبار سنتے یا خود کوئی قصہ چھیڑ دیتے۔ قصہ بھی کون سا اپنی زندگی کا۔ مجھے اُن کی زندگی کے کئی قصوں نے بہت متاثر کیا۔ قصے سے متعلق افراد کے نام تو بھول گئی لیکن خاکہ اب بھی موجود ہے۔ ایک بار اُنہوں نے بتایا۔ ہندوستان میں پہلی بار پنکھا آیا۔ ٹیبل فین جو بیٹری سے چلتا تھا۔ علی گڑھ میں یونیورسٹی سے متعلق کوئی ذمہ دار انگریز افسر تھے انہوں ہی نے منگایا تھا۔ پنکھا چلانے کی ترکیب ساتھ نہ تھی۔ انہوں نے ہر طرح کوشش کر لی کہ چل جائے لیکن نہ چلا۔ طے یہ پایا کہ یونیورسٹی کے سائنس پروفیسر کو بلایا جائے۔ لہٰذا وہ طلب کیے گئے۔ اب وہ اپنے مخصوص انداز میں کہتے۔ ''بھلا کاہے کو اس سائنس پروفیسر نے پنکھا دیکھا ہوگا۔'' اس زمانے میں سائنس، مقناطیس، بجلی اور اسی قسم کے دو چار عنوانات کے تحت پڑھائی جاتی تھی جن کی پتلی پتلی کتابیں انگلستان سے چھپ کر آتی تھیں۔ صبح وہ خود گھر پر اُن کا مطالعہ کرتے اور پھر کلاس میں لڑکوں کو پڑھایا کرتے۔ یہ وقت اُن پر ایسا آ پڑا تھا کہ عزت بحال کرنی مشکل تھی۔ کیونکہ اس زمانے میں سائنس پروفیسر کی اہمیت کا کچھ پوچھنا نہ تھا۔ مختصر یہ کہ

انہوں نے ڈھائی گھنٹے کی اُلٹ پھیر کے بعد جب ہرے اور لال رنگ کے تاروں کی اصلیت جان لی تو مثبت منفی تار جوڑنے سے پنکھا چل پڑا اور پھر جو اُن کی تعریف ہوئی وہ کم نہ تھی۔ یہ واقعہ آج کے لحاظ سے بچوں کا کھیل ہے اور کوئی اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ اب تو چھٹی جماعت کا طالب علم بھی یہ اصول جانتا ہے۔ لیکن یہ واقعہ اُس زمانے کا ہے جب اکثر نے بجلی سے چلنے والی کوئی چیز دیکھی ہی نہیں تھی اور پڑھانے والے نے بھی خود کبھی سائنس نہیں پڑھی تھی۔ اِس طرح کے کئی واقعات ہیں۔ ایک انٹرویو کے دوران انگریز کا یہ سوال کہ ''مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کا اثر مسلم یونیورسٹی پر کس قدر ہے؟

جواب اگر اثبات میں دیتے ہیں کہ اثر نہیں ہے تو غلط ہے جسے وہ انگریز خود بھی جانتا ہے۔ پانچ منٹ کا وقت ہے اور اس میں اُنہیں جواب دینا ہے۔ اُنہوں نے انگریز افسر سے کہا جناب سوال آپ کا چھوٹا ہے لیکن جواب کے لیے پورا دن چاہیے اور آپ کے دفتر کی ہدایت ہے کہ آپ کے پاس صرف پانچ منٹ ہیں۔ انگریز اُن کی جرأت سے متاثر ہوا اور کہا اپنا وقت لو اور مجھے پورا جواب دو۔ اُنہوں نے اِس موقع پر دو گھنٹے تک گفتگو کی اور جب اٹھے تو وہ انگریز افسر اُنہیں خود دروازے تک چھوڑنے آیا اور مسلم یونیورسٹی میں ملازمت کی نوید سنا دی۔

مولانا سلیمان اشرف کو اُن کی مرضی کے خلاف میلاد شریف پڑھنے کے لیے تیار کرنا اُن ہی کا کام تھا۔ یہ سب اُن کی شخصیت کا سحر تھا۔ وہ خود کہتے نیک نامی، بڑائی اور اثر پیدا کرنے کے لیے دیانت اور سچائی کو اپنانا ضروری ہے۔ اِسی اصول کو اپنا کر انہوں نے اپنی شخصیت میں وہ رچاؤ پیدا کر لیا تھا کہ جس سے ہر فرد مرعوب ہو جاتا۔ اُن کی شخصیت تو بے شمار واقعات کا مرکّب ہے۔ اور اِن واقعات سے اُس دور کی سیاسی، انفرادی، سماجی اور معاشی قدروں کا پتہ چلتا ہے۔

پرنسپل میور، الٰہ آباد کالج اُن کی انگریزی اور ریاضی کی قابلیتوں کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ابوالحسن محنتی اور شریف نوجوان ہیں۔ اُنہیں اُن کی انتھک محنت اور قابلیت پر گورنمنٹ سے وظیفہ ملا ہے اور ریاضی میں ساری یونیورسٹی میں اوّل آنے پر انہیں

اقبال گولڈ میڈل دیا گیا ہے۔"

زمانۂ طالب علمی کے بعد وہ علی گڑھ کالج سے منسلک ہو گئے۔ جب ڈاکٹر ضیاء الدین لندن گئے تو ان کی جگہ وہ ڈیوٹی سوسائٹی کے انچارج مقرر ہوئے۔ ماریسن نے کالج کی سالانہ رپورٹ میں اُن کی خوش اسلوبی سے متاثر ہو کر کہا۔

"مَیں اِس موقع پر ابوالحسن صاحب کی خدمات کا عمومی طور پر اعتراف کرتا ہوں۔"

ماریسن جو کسی کی تعریف کرنے میں بڑا سخت تھا۔ اُس نے اُن کے متعلق کہا۔

"اگر ہمارے (ایم اے او کالج) کے پاس اتنا سرمایہ ہوتا تو ہم انہیں کیمبرج ولایت پڑھنے کے لیے بھیجتے۔"

اُس نے اُن کی کھیلوں کی صلاحیت پر بھی لکھا ہے۔

"ابوالحسن گھوڑے کی سواری ماہرانہ اور شاندار انداز پر کرتے ہیں۔ وہ ٹینس اور کرکٹ کے بہترین کھلاڑی ہیں۔"

ماریسن نے انہیں رنگون کالج میں تقرری کے لیے اِس خط کے ساتھ بھیجا۔

"ہمارے پاس اتنا سرمایہ نہیں کہ ہم اُن کو اُن کی قابلیّت کے لحاظ سے تنخواہ دے سکیں۔ مَیں انہیں قلق کے ساتھ چھوڑوں گا لیکن انہیں اتنی کم تنخواہ پر رکھنا ناانصافی ہے۔"

نواب اسحاق خان آنریری سیکریٹری ایم اے او کالج کے ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشنز کو آپ نے یہ تجویز بھیجی۔

"مَیں ابوالحسن صاحب کو آپ کے سامنے پیش کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہوں۔ میرے دل میں ان کی بڑی عزت ہے۔ یہ چاق و چوبند، دفتری کاموں میں طاق ہیں۔ تعلیمی قابلیّت اور انتظامی صلاحیت معیاری ہے۔"

نواب مزمّل اللہ نے لکھا:

"ابوالحسن صاحب کا تقرر اسسٹنٹ سیکریٹری کے عہدے پر یکم جون 1904ء سے ہوا ہے۔ اُس وقت سے جس خوبی، خوش اسلوبی، محنت، شرافت، دیانت،

امانت، اطاعت، عزت اور قومی محبت کے ساتھ اُنہوں نے یہ کام انجام دیا ہے اُس کا حال ٹرسٹی صاحبان اور خود نواب محسن الملک کو بھی رہا ہے۔ مختصر یہ کہ اِس عہدے کے واسطے ہر حالت کے اعتبار سے اُن سے زیادہ موزوں شخص میری رائے میں تو ملنا اگر محال نہیں تو سخت دشوار ضرور ہے۔ گویا خداوند تعالیٰ نے اُنہیں اِسی خاص کام کے واسطے پیدا کیا ہے۔''

نواب وقار الملک نے بھی اُن کے بارے میں تحریر کیا ہے۔

''مَیں نے مولوی ابوالحسن کو بلحاظ اُن کی بہت سی اعلیٰ قابلیّتوں کے اور بلحاظ اُن کے اعلیٰ اخلاق اور دین داری کے کالج کے کاموں کے علاوہ اور دوسری بہت سی مختلف الاقسام خدمات کے واسطے (جن میں مجھ کو اُن سے بہت مدد ملی) ہر طرح موزوں پایا۔ میری رائے مولوی صاحب کی نسبت بہت عمدہ قائم ہوگئی ہے۔''

مولوی مزمّل اللہ نے لکھا:

''جو پوزیشن کالج میں بہ لحاظ اہمیت اس عہدے کے اور بہ لحاظ ان کے ذاتی شریفانہ برتاؤ اور انہماک کا قومی محبت کے ہے اس کا قائم رکھنا اس کو بڑھانا ہمارا فرض ہے۔ اور اس عہدے کا نہایت کار آمد ہونا اور سخت ضروری ہونا واقعہ نفس الامری ہے جس کو اس خاص شخص کے تقرر نے اور بھی زیادہ خوش اسلوبی کے ساتھ ثابت کر دیا ہے۔''

خان بہادر نواب مزمّل اللہ آنریری سیکریٹری ایم اے او کالج نے کہا۔

''دشوار گزار امر ہونے کے باوجود مولوی ابوالحسن نے یکساں اعتماد و اعتراف نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک بہادر اور اس خاکسار نیز موجودہ آنریری سیکریٹری بہادر کا حاصل کیا ہے۔ ان کا تعلق کالج سے ایک ملازم اور اہلکار کا سا ہرگز نہیں بلکہ وہ اس کام کو ذاتی کام اور قومی کام کی طرح پورے شغف، محنت اور ایمانداری کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ اُن کی لیاقت، تجربہ اور طریقۂ انجامِ خدمت ہر ایک تعریف سے بالاتر ہے۔ اُن کا

درجہ قوم میں اہم ہے۔''

وہ زندگی بھر ڈاکٹر ضیاء الدین کے دوست رہے۔ اکثر انہیں یاد کرتے۔ تنہائی میں بیٹھے اُن سے باتیں کرتے۔ ہم بچوں کو بٹھا کر اُنہوں نے بتایا کہ ڈاکٹر ضیاء الدین کو اُنہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی کے احاطے میں دفن کرانے کے لیے بڑی محنت کی اور تمام تر مخالفتوں کا خوش اسلوبی سے مقابلہ کیا۔

مرنے سے قبل وہ اپنی تمام اہم دستاویزات جو بچا کر ہندوستان سے لا سکے تھے، مجھے سونپ دیں۔ میرے لیے یہ بڑے فخر اور اعزاز کی بات تھی کہ بڑے بڑوں کی موجودگی میں انہوں نے مجھے اِس لائق سمجھا۔ مَیں جو ابھی صرف طالب علم تھی۔

یہ کاغذات میرے پاس محفوظ ہیں۔ یہ صفحات زمانے کی گردش سے پیلے پڑ رہے ہیں۔ اُن پر ایک صدی گزر چکی ہے اور دوسری صدی کا بھی دوسرا عشرہ چل رہا ہے۔ مَیں انہیں اپنی زندگی تک تو سنبھال کر رکھ پاؤں گی جن کے کونے بھی جھڑ رہے ہیں اور جن کی سیاہی بھی پھیکی پڑ رہی ہے۔ مگر حروف اب بھی چمک رہے ہیں اور اُن کی چمک اور روشنی سے ہم اپنی بقیہ زندگی کو اجالا بخشنے کی سعی کرتے رہیں گے۔

(24 جون 1968ء روزنامہ جنگ کراچی میں شائع ہوا اور برسی پر پڑھا گیا)

❑

ہمارے دادا مولوی ابوالحسن

ان کا ذکر ''تذکرۂ مشاہیرِ غازی پور''
(مؤلف، عزیز الحسن صدیقی)
کے صفحہ 165 پر درج ہے

''حاجی مولوی ابوالحسن بن مولوی محمد علی قاری اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باوضع و بااصول آدمی تھے۔ شکل وصورت، وضع قطع اور داڑھی بالکل مولانا آزاد جیسی تھی۔ طرزِ کلام بھی ان ہی جیسا تھا۔ اسلامی علوم کے ساتھ عصری علوم پر بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ سیرت وتاریخ ان کے خاص موضوع تھے۔ آئی ای ایس تھے۔ کشمیر میں ڈائرکٹر آف ایجوکیشن رہ چکے تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر بھی تھے۔ ابتدا میں اسی یونیورسٹی میں سائنس کے شعبے میں استاد بھی رہ چکے تھے۔ یونیورسٹی جب مدرستہ العلوم کے نام سے جانی جاتی تھی اس وقت اس میں اسسٹنٹ سیکریٹری کے عہدے پر فائز تھے۔ محلّہ مچھرہٹہ میں سڑک کے کنارے ان کا مکان ''حسن منزل'' کے نام سے تھا۔ 1955ء میں ترکِ وطن کر کے پاکستان چلے گئے اور وہیں 1965ء میں بہ مقام کراچی انتقال ہوا۔''

نوٹ:

(یہاں میں اپنے دادا اور ابّا کی تاریخِ وفات کی تصحیح کرنا چاہوں گی۔ دادا کا انتقال 16 جون 1965ء کو ہوا جبکہ کتاب میں 1957ء تحریر ہے۔ ابّا جان کا انتقال 14 ستمبر 1946ء کو ہوا جب کہ کتاب میں 1948ء تحریر ہے)

اس کتاب میں خاندان کے بیشتر بزرگوں کے بھی نام موجود ہوں گے۔ مَیں اُن کی تفصیل میں نہیں جا رہی ہوں۔

مُرتّب

مُرتب

کمال یار جنگ تعلیمی کمیٹی

ابتدائیہ: برِ صغیر میں تعلیمی منصوبہ بندی کی بنیاد

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ کلکتہ 28 دسمبر 1939ء کی صدارت کرتے ہوئے نواب کمال یار جنگ بہادر نے اس بات پر بطورِ خاص زور دیا کہ مسلمانوں کی تعلیمی سماجی اور تہذیبی روایات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک سروے کیا جائے جو ان کے لیے کارآمد ہو۔ یہ برِ صغیر کی تاریخ میں مسلمانوں کی تعلیمی صورتِ حال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پہلا موقع تھا جو باقاعدہ کسی کانفرنس کی صورت میں منعقد ہوا اور مسلسل دو دن چلتا رہا۔ صدارتی خطبے کی اہمیت اپنی جگہ لیکن یہ موضوع عام لوگوں میں بھی زیرِ بحث رہا۔ اور بالآخر متفقہ طور پر فیصلہ کیا گیا کہ یہ سروے ضرور کیا جائے اور پوری سنجیدگی کے ساتھ کیا جائے کہ یہ مسلمانوں کے لیے ازحد ضروری ہے۔

اس موقع پر کمال یار جنگ تعلیمی کمیٹی کی نامزدگی کی گئی جس کی تائید اے کے فضل الحق نے کی۔

کمیٹی کے عہدیداران

صدر: نواب کمال یار جنگ بہادر

سکریٹری: پروفیسر عبدالمجید قریشی

ارکانِ کمیٹی

1۔ علامہ عبداللہ یوسف علی، ایم اے، ایل ایل ایم، سی بی ای، آئی سی ایس ریٹائرڈ

2۔ سر شیخ عبدالقادر بارایٹ لاء
3۔ سر عبدالعزیز الحق، بی اے، (آکسن) ایل ایل ڈی
4۔ ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین، ایم اے، ایل ڈی، بارایٹ لاء
5۔ ڈاکٹر سر احمد فضل الرحمٰن، بی اے (آکسن) ایل ایل ڈی
6۔ ڈاکٹر عبدالعزیز پوری، ایم اے، پی ایچ ڈی (لندن)
7۔ حاجی مولوی ابوالحسن، آئی ای ایس ریٹائرڈ
8۔ مولوی سیّد طفیل احمد
9۔ خان فضل محمود خان، ایم اے (کینٹب)

کمیٹی کا پہلا اجلاس

کانفرنس کے قیام کے فوری بعد نواب کمال یار جنگ بہادر کمیٹی کا اجلاس 4 جنوری 1940ء کو ہوا تاکہ بات آگے بڑھائی جائے۔ اس کے لیے تمام اراکین کو بذریعہ خطوط حیدرآباد میں 26 جنوری 1940ء کو پہلے اجلاس کے لیے مدعو کیا گیا۔ یہ اجلاس خان خاناں پیلس میں منعقد ہوا جس میں طے کیا گیا کہ ایک سوال نامہ ترتیب دیا جائے تاکہ رائے عامہ کا علم ہو اور یہ بھی کہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں جا کر اعداد و شمار حاصل کیے جائیں۔

اس کمیٹی کے چیرمین سر عزیز الحق تھے۔ مولوی ابوالحسن، ڈاکٹر عزیز پوری اور پروفیسر عبدالمجید اراکین منتخب کئے گئے۔

اس کمیٹی نے جن جگہوں کا دورہ کیا اُن کے نام یہ ہیں۔

بمبئی، مدراس، بنگال، دہلی، اجمیر، بلوچستان، پنجاب، متحدہ صوبہ جات بہار، اڑیسہ، آسام، NWFP، سندھ، حیدرآباد، میو، بھوپال، رام پور، کشمیر، اندور، گوالیار، پروداد، بہاولپور اور پٹیالہ۔

اس کمیٹی نے دسمبر 1940ء میں پونا کے اجلاس میں اپنی رپورٹ پیش کی جس میں سوالنامے کی تشکیل میں جو مشکلات درپیش تھیں، انہیں بیان کیا گیا۔ اس کے علاوہ سوال نامہ کی تقسیم کا مسئلہ بھی زیرِ بحث رہا۔ اس رپورٹ کے صفحہ x پر درج ہے کہ میٹنگ میں شرکت کے لیے کچھ لوگ

آتے تھے اور کچھ نہیں بھی۔ لیکن مولوی ابوالحسن وہ واحد ممبر تھے جو ہر میٹنگ میں پوری تیاری سے آتے اور انتہائی انہماک سے کام کرتے جس سے لگتا کہ اُنہیں ہندوستان میں مسلمانوں کے تعلیمی معیار، مسائل اور ان کے حل سے حد درجہ دلچسپی تھی۔ کمال یار جنگ تعلیمی کمیٹی کے مقاصد مسلمانوں کے لیے بڑے دُوررس تھے۔ اس کی تفصیل میں جانے سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں اس کمیٹی کے اغراض و مقاصد کس قدر اہم تھے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اب بھی اس رپورٹ سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اگرچہ یہ کتاب اب نایاب ہے اور ہمیں علم نہیں کہ یہ ہندوستان پاکستان کی کس کس لائبریری میں موجود ہے۔ یہ کتاب بہت ضخیم اور تقریباً 383 صفحات پر مشتمل ہے اور یہ Bhupendra Lal بینر جی کے زیرِ اہتمام یونیورسٹی پریس کلکتہ سے شائع ہوئی ہے۔

خوش قسمتی سے یہ کتاب ہمارے بھائی طارق صدیقی کے پاس موجود تھی جو انہوں نے ازراہِ مہربانی ہمیں عطا کر دی ہے۔ ہم نے ویب سائٹ پر بھی اس کتاب کی تلاش کی جہاں صرف یہ لکھا ہے کہ کمال یار جنگ تعلیمی رپورٹ Available نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ نایاب اور بہت اہم رپورٹ کسی نہ کسی طور پر تاریخ میں موجود رہے۔

REPORT

OF THE

KAMAL YAR JUNG EDUCATION COMMITTEE

CONTENTS

PAGE

INTRODUCTORY i

PART I—SURVEY OF MUSLIM EDUCATION

I. MUSLIMS IN MADRAS 3

II. HISTORY OF MUSLIM EDUCATION IN MADRAS 9

III. PROBLEMS OF MUSLIM EDUCATION IN MADRAS UNIVERSITY REGULATIONS 38

IV. CONGRESS MINISTRY IN MADRAS .. 50

V. CENTRAL PROVINCES AND BERAR—HISTORY AND CULTURAL INFLUENCE OF ISLAM .. 66

VI. HISTORY OF MUSLIM EDUCATION IN THE CENTRAL PROVINCES AND BERAR .. 85

VII. THE VIDYA MANDIR SCHEME 113

VIII. THE CONGRESS MINISTRY IN THE CENTRAL PROVINCES AND BERAR 122

IX. NAGPUR UNIVERSITY 135

X. MUSLIM EDUCATION IN BOMBAY AND SIND .. 142

XI. THE WARDHA SCHEME 168

XII. MEMORANDA AND EVIDENCE ABOUT PROVINCES AND STATES 186

PAGE

PART II—REVIEW AND RECOMMENDATIONS

Universities	227
Central Islamic Research Organisation ..	250
Oriental Education	253
Secondary Education	256
Primary Education	265
Conclusion	271
Note by Sir Shaikh Abdul Qadir	272
Note by Principal W. H. Siddiqui	272
Note by the Hon'ble Sir M. Azizul Huque ..	273

APPENDICES

Appendix A :	President's Letter ..	302
Appendix B :	Questionnaire ..	304
Appendix C :	Distribution List of Questionnaire ..	315
Appendix D :	President's Letter regarding Local Committees ..	316
Appendix E :	Tour Programme ..	320
Appendix F :	Islamic History and Culture : Revised Syllabus in the Calcutta University ..	324
Appendix G :	Secondary Education Scheme and Syllabus ..	329
Appendix H :	Primary Education Scheme and Syllabus	342
Appendix I :	Statistical Tables ..	372

(ii)

Personnel of the Committee

In terms of another resolution unanimously passed at the Conference, Nawab Kamal Yar Jung Bahadur was appointed president and Khan Bahadur Prof. Abdul Majeed Kureishy, M.A., secretary of the committee, and the president was also empowered to select the personnel of the committee from a list of persons unanimously agreed to at the Conference. After discussion with some of the leading educationists and public men, the President decided that the committee should consist of the following persons :—

1. Nawab Kamal Yar Jung Bahadur—*President*.
2. Allama Abdullah Yusuf Ali, M.A., LL.M., C.B.E., I.C.S. (Retd.).
3. Sir Shaikh Abdul Qadir, Kt., Barrister-at-Law.
4. The Hon'ble Sir M. Azizul Huque, Kt., C.I.E.
5. Dr. Sir Ahmed Fuzlur Rahman, B.A. (Oxon.), LL.D.
6. Dr. Khalifa Shujauddin, M.A., LL.D., Bar.-at-Law.
7. Dr. Abdul Aziz Puri, M.A., Ph.D. (Lond.).
8. Haji Maulvi Abul Hasan, I.E.S. (Retd.).
9. Maulvi Syed Tufail Ahmed.
10. Khan Bahadur Prof. Abdul Majeed Kureishy, M.A. —*Secretary*.
11. Mr. Khan Fazl Mohammed Khan, M.A. (Cantab).

PUBLISHED BY KHAN BAHADUR PROFESSOR A. M. KURESHY,
SECRETARY, KAMAL YAR JUNG EDUCATION COMMITTEE
AND
PRINTED BY BHUPENDRALAL BANERJEE AT THE CALCUTTA UNIVERSITY PRESS

وہ خطوط جو نواب مزمّل اللہ خان، نواب محسن الملک نے مولوی ابوالحسن کے نام لکھے۔ اور وہ خطوط جو مولوی ابوالحسن نے اُن دو بزرگوں کی خدمت میں بحیثیت آنزیری اسسٹنٹ سیکریٹری مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ، تحریر کیئے، جن سے یونی ورسٹی کی سیاسی اور علمی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے۔

محترم مہر الٰہی ندیم نے اِن میں سے کچھ خطوط ہمیں فراہم کیئے۔ ہم اُن کے شکر گزار ہیں۔

﴿ابوالحسن﴾

Honorary Secretary's
M.A.O.College

۳۰/اپریل ۱۹۰۷ء

مخدوم ومکرم! بندہ جناب خان بہادر صاحب

تسلیم عرض ہے۔

جو اطلاع میں نے براؤن صاحب کی اور شیعہ سنی پارٹی کے متعلق دی تھی وہ روز بروز پایۂ ثبوت کو پہونچتی ہے۔ طلبا کی جماعت نے ایک کمیٹی بنائی ہے جس کا نام سرسید کمیٹی رکھا ہے اس کا مقصد اتحاد قائم رکھنا اور طلباء کی شکایت کو باضابطہ اور موئدبانہ پیش کرنا اور عام طلباء پر قابو رکھنا ہے تاکہ ہر فرد بشر خود اختیاری سے کوئی کام نہ کر بیٹھے۔ جو تجاویز یہ کمیٹی پاس کرتی ہے اس پر سب طلباء عمل کرتے ہیں۔ ادھر اکثر اوقات جو بات سرسید کمیٹی نے کرنی چاہی شیعہ طلبا نے اس کی مخالفت کی ہے جس سے اس تفرقہ کا پتہ چلتا ہے۔ دو اہم واقعات جو اس ہفتہ میں پیش آئے ان کو مفصل عرض کرتا ہوں۔

واقعہ اول متعلق میلاد شریف بارہ وفات۔

جمعہ گذشتہ کو بارہ ربیع الاول کی تاریخ تھی۔ پنجشنبہ کے روز سرسید کمیٹی نے میلان ظاہر کیا کہ چوں کہ دوسال سے محفل میلاد شریف نہیں ہوئی ہے امسال بھی نہ کی جائے تو بہتر ہے کیوں کہ پچھلے سالوں میں شیعہ طلباء کی مخالفت سے نہیں ہوئی۔ اس پر شیعہ طلبا نے سنیوں کو ابھار کر کہا کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور متفق ہیں ضرور میلاد شریف ہونا چاہئے مکرر واور ضرور کرو۔ اس ابھار نے پرسنی طلبا نے سرسید کمیٹی کو پھر مجبور کیا۔ کمیٹی مذکور مجبور ہوکر چند آدمی بطور ڈیپوٹیشن کے میرے پاس اجازت اور صلاح کے لئے بھیجے۔ ان کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی تھے جو مصر تھے کہ میلاد شریف ہونا چاہئے۔ میں نے ان سے کہا کہ اجازت دینا میرے اختیار میں نہیں ہے لیکن دوستانہ صلاح دے سکتا ہوں۔ شیخ عبداللہ صاحب بھی آج کل مع اہل وعیال کے میرے مکان میں مقیم ہیں۔ میں نے شیخ صاحب کو بھی بلایا اور لڑکوں سے کہا کہ شیعہ طلبا آج متفق ہیں مگر محرم میں مجلس کی درخواست کریں گے اور وہی وقت پیش آئے گی جو پچھلے سال پیش آئی تھی۔ اس سے بہتر ہے کہ محفل میلاد نہ کی جائے۔ اس پر طلبا راضی نہ ہوئے اور کہا کہ پرنسپل صاحب سے ہم نے اجازت لے لی ہے۔ یا تو آپ ہم کو حکما منع کر دیجئے یا اجازت دیجئے۔ میں نے کہا کہ حکما منع نہیں کر سکتا، اس لئے آئندہ وقت اب دوسری صلاح دیتا ہوں کہ جس سے تمہارا مقصد بھی حاصل ہو اور آئندہ وقت بھی پیش نہ آئے۔ وہ یہ کہ پرانے طریقہ پر محفل میلاد شریف کرنے کے لئے فیشن کا جلسہ ''یوم النبی'' 'Prophet's Day' کے نام سے قرار دو اور اس میں آنحضرت کے زندگی

کے حالات بطور لکچر واسپیچ کئے جائیں۔ فاتحہ، خوشبو، قرآن خوانی وغیرہ سب ہو مگر شیرینی اس میں تقسیم نہ ہو بلکہ دوسرے روز کمروں پر اور گھروں پر تقسیم کی جائے اور جلسہ اسٹریچی ہال میں ہو اور کرسیوں پر نشست ہو۔ خیر خلاصہ یہ ہے بعد ردّ وقدح کے دوسرے روز بارہ بجے سرسید کمیٹی نے طلبا کو اس صلاح پر کاربند ہونے کے لئے راضی کرلیا۔ درمیان میں جو دقتیں پیش آئیں وہ شیعہ طلبا کی طرف سے ۔ وہ بالکل طرز جدید کے خلاف تھے۔ اور معلوم ہوا کہ مولوی فدا حسین صاحب معلم دینیات شیعہ مذہب نے لڑکوں کو سمجھایا کہ اس طرز سے تمہارا مطلب فوت ہوتا ہے اور تم مجلس اس بار نہ کرسکو گے۔ آخرکار کمتر اُس جلسہ میں شریک ہوئے اور اکثر شیعہ طلبا مخالف رہے۔ اور ان کے جلسے الگ ہوتے ہیں۔

واقعہ دوم متعلق ڈیوٹی سوسائٹی کے

مسٹر براؤن انجمن الفرض کے کیپر یعنی صدر انجمن ہیں۔ جو کچھ ڈیوٹی کا حشر ان کے زمانہ حکومت وائسری میں ہوا اس کی تفصیل شہادت میں کمیشن کے سامنے پیش ہوچکی ہے۔ یہ سوسائٹی اب انحطاط کی طرف مائل ہوگئی ہے اور اس کے ممبر مقرر کرنے والے کو تفرقہ پیدا کرنے اور پارٹی بنانے میں خاص طور سے کامیابی ہوسکتی ہے۔ ان تمام خیالات سے میں نے طلبا کو راضی کیا کہ وہ مسٹر براؤن کے بجائے جن کا تقرر اب دوبارہ ہونا چاہئے کیوں کہ بموجب قاعدہ کے تین برس کے بعد مدت صدارت ختم ہوجاتی ہے اور دوسرے کو یا اسی شخص کو دوبارہ منتخب کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس

وقت براؤن صاحب کی مدت ختم ہوگئی ہے لہذا بجائے ان کے ڈاکٹر ضیاء الدین کو جو بانیان انجمن کے وقت سے اس کے سکریٹری تھے اور بڑی کامیابی سے اس انجمن کو چلاتے رہے ہیں۔ ان کو کیپر یعنی صدر انجمن کیا جائے۔ ادھر طلبا براؤن صاحب کے عارضی اخلاق سے راضی ہوگئے تھے اور اس لئے ان کو قائم رکھنا چاہتے تھے مگر چند شیعہ طلبا نے اونچا نیچا سمجھایا چنانچہ وہ راضی ہوگئے کہ ڈاکٹر ضیاء الدین کو کریں۔ اب جب کہ اوروں کو بھی کہہ سن کر راضی کیا اور دستخط کرنے لگے تو انہیں شیعہ طلبا نے دستخط کرنے سے انکار کیا، اور اب وہ براؤن صاحب کے معاون بن گئے۔ وہ روز لان کو جا کر خبریں دیتے ہیں کہ فلاں فلاں تم کو علیحدہ کرنے اور ضیاء الدین کو مقرر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اب براؤن صاحب کے معاون بن گئے ہیں۔ اور روز ان سے جا کر خبریں دیتے ہیں کہ فلاں فلاں تم کو علیحدہ کرنے اور ضیاء الدین کو مقرر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ لوگ خاص طور سے آج براؤن صاحب کے ہو رہے ہیں۔ یہ واقعات بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ وہ خبر تفرقہ پیدا کرنے اور علاحدہ پارٹی بنانے کی صحیح ہے۔ چنانچہ لڑکوں نے دستخط کر کے بلا شرکت ان طلبا کی عرضی بھیج دی ہے۔ مگر ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب ہچکتے ہیں اور منظور نہیں کرتے۔ وہ براؤن صاحب یا کسی انگریز کے مد مقابل نہیں ہونا چاہتے۔ اور بڑا اندیشہ ہے کہ اگر انھوں نے قطعی انکار کر دیا تو مشکل ہوگی۔ براؤن صاحب سے یہ کام چلے گا نہیں اور وہ بجائے طلبا کو متحد القوت کرنے کے ان کو پراگندہ اور متفرق کریں گے جس کا انجمن پر اور کالج دونوں پر بہت بڑا اثر پڑے گا۔

Honorary Secretary Office
M.A.O.COLLAGE

علی گڑھ

۱۰/جون ۱۹۰۷ء

بحضور خان بہادر صاحب

تسلیم عرض ہے۔ حاجی موسیٰ خاں صاحب کے دو خط آئے ہیں۔ رجسٹرڈ شدہ۔ نقل ارسال خدمت بابرکت ہے۔ اب یہ سامان نیا، صاحبزادہ صاحب پر اور نواب محسن الملک بہادر پر حملہ کا ہورہا ہے۔

براؤن صاحب کے متعلق تازہ خبر یہ ہے کہ انھوں نے کل ہی نصف درجن کرسیاں دینے سے انکار کر دیا جو معزز مہمان کے لئے مانگی تھیں۔ تفصیل یہ ہے کہ خاناں بہادر (۱) جو حیدر آباد دکن کے شاہی خاندان کے رکن اعظم ہیں ان کے صاحبزادے کالج میں داخل ہونے آئے ہیں۔ کالج میں جگہ نہیں ہے۔ اور جس طرح رنگون کے لڑکوں کو مع سیٹھ صاحب کے آرنلڈ ہاؤس میں ٹھیرا دیا گیا تھا اور فرنیچر وغیرہ سے کمرہ کو چند دن کے لئے درست کر دیا گیا تھا اسی طرح ڈاکٹر ضیاء الدین نے خاناں بہادر کے لڑکے اور ان کے اتالیق وغیرہ کے لئے ویسا ہی سامان کرنے کو کہا۔ میں نے براؤن صاحب کو لکھا جو کرسیاں پرنس آف ویلز فرنیچر میں سے انھوں نے کتب خانہ کے لئے رکھ لی ہیں ان میں سے نصف درجن دیدیں۔ ان کو مفصل سب

ضرورت لکھ دی تھی مگر انھوں نے انکار کر دیا۔اسی طرح کوئی ٹرسٹی صاحب آ جائیں گے تو ہم فرنیچر کے محتاج ہوں گے۔ اطلاعاً عرض ہے ڈاکٹر ضیاءالدین اور شیخ عبداللہ صاحب دونوں کو براؤن صاحب کی یہ حرکت بہت ناگوار ہوئی مگر سوائے خاموشی کے چارا کیا ہے۔اطلاعاً عرض دیتا ہوں۔آپ مالک ومختار ہیں جو حکم دیں عمل ہوگا۔

اسٹاف کی یہ حالت ٹرسٹیوں کی وہ حالت جو شخص دل برداشتہ نہ ہو تعجب ہے۔ ہم تو خادم ہیں سب نرم وسخت برداشت کرنا پڑتا ہے۔مگر آپ کی دل برداشتگی واقعی بہت بجا ہے۔مگر آں را کہ عقل بیش غم روزگار بیش۔اور آپ لوگوں کا دل اور ظرف بھی خدا نے بڑا بنایا ہے اسی سے کچھ کالج برا بھلا چل بھی رہا ہے ورنہ یہ متضاد حالات اور کیفیات ایک دن میں کالج بیٹھا دیں۔دوسرا شخص ایسے زمانہ پرُآشوب میں جب کہ نواب صاحب قبلہ بھی یک گونہ ہمت ہار کر الگ ہو رہے ہیں اس کالج کی کل کو مشکل سے چلایا جاسکتا تھا۔حق تو یہ ہے کہ یہ بھی آپ ہی کا کام ہے مگر افسوس قدر کرنے والے کم اور روڑے اٹکانے والے دنیا میں ہر جگہ زیادہ ہیں۔زیادہ کیا عرض کروں۔

والتسلیم

خاکسار

ابوالحسن

میں انشاءاللہ پرسوں دفتر کر کے جاؤں گا مفصل اطلاع پہلے دے چکا ہوں اب جو خطوط کہ مکان سے آرہے ہیں ان سے تردد پریشانی بڑھتی جارہی ہے۔

ابوالحسن

علی گڑھ

۱۳ر جولائی ۱۹۰۷ء

بحضور خان بہادر صاحب! تسلیم عرض ہے۔

آج کی ڈاک نے بے حد تکلیف پہنچائی اور دل کو چوٹ اور صدمہ محسوس ہوا۔ بالخصوص آپ کا نہایت مہربانی آمیز والا نامہ جو کہ میرے اور دفتر والوں کے نام تھا یہ عرض کرنا کہ کس عمدگی کے اور خوبصورتی سے اس درمیان میں کام ہوا ہے چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ لیکن میں خدا کو درمیان دے کر کہتا ہوں کہ تمام دفتر والے بے حد خوش رہے ہیں۔ بیشک کام زیادہ ہوا مگر وقت وقت پر، حکم فوراً بلا تعویق وتذبذب صادر ہوئے۔ تعمیل میں ذرا دقت نہیں پیش آسکتی تھی۔ بہر کیف خدا سے دعا ہے کہ وہی حالت قائم رہے اور جو بات آج دل کو تکلیف دے رہی ہے دور ہو جائے۔ آمین۔

بہ تعمیل ارشاد کل خطوط نقل کر کے اصل بذریعہ رجسٹرڈ روانہ کر دیا اور تار بھی نواب محسن الملک بہادر کو دے دیا مگر اس قدر اپنی طرف سے اضافہ کرنے کی جرأت کی کہ فوراً نواب ممتاز الدولہ بہادر کے پاس دوڑا ہوا گیا۔ ممدوح تمام واقعات سن کر بہت متاثر ومتأسف ہوئے اور غالباً آپ کو خط لکھیں۔ مجھ کو منع کیا گیا کہ رجسٹرار پرنسپل وغیرہ سے کچھ ذکر نہ کروں۔ چنانچہ میں نے آپ کے تعمیل ارشاد میں حضور کی عدول حکمی کی ہے۔ خدا

کرے نتیجہ حسب خواہ ہمارے اور نواب ممدوح کے ہو۔

نہایت ادب سے اس امر کے عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں اور معافی کا خواستگار رہوں۔ اس جرأت کے لئے تمام کام کالج کے ایک دم بند ہو گئے۔ کوئی چیک کا روپیہ نہیں مل سکتا اور کوئی بل ادا نہیں ہو سکتا۔ سخت وادیلا مچ گئی ہے۔ بالخصوص تعمیر کے محکمہ میں مزدوروں کی مزدوری اور چیزوں کی قیمت نہیں دی جا سکتی۔ علاوہ معمولی ہرج کے اس وقت کچھ سامان متعلق عمارت اسٹیشن پر پڑا ہوا ہے۔ جس کے نہ چھڑانے کی وجہ سے مبلغ ۱۴ر روپیہ روزانہ کا تاوان دینا پڑے گا۔ یہ سب اور لکھ کر نہایت ادب سے درخواست کرتا ہوں کہ کم از کم چیک پر دستخط اور ہمارے دفتر کے احکامات جاری رکھئے۔ زیادہ، بجز حسرت وافسوس کے کیا عرض کروں۔

آپ اپنی اور نیز صاحبزادہ کی خیریتِ مزاج سے مطلع فرمائیے۔ سخت تعلق وتردد ہے۔ والتسلیم

خاکسار

ابوالحسن

☆☆☆

M.M.
Doc. No.13
15 July 1907
Reg. No. 8

۱۵ر جولائی ۱۹۰۷ء
وائس اینکس ہوٹل

ڈیر ابوالحسن صاحب

آپ کا تار اور رجسٹری شدہ خط پہنچا۔ افسوس ہے کہ آپ نے مختصر طور پر بھی نہ لکھا کہ کس بات پر خان صاحب[1] اور صاحبزادے[2] میں تیز کلامی ہوئی۔ پرائیویٹ طور پر تو کچھ مجھے لکھا ہوتا تا کہ خلجان نہ ہوتا۔ اب جب تک کہ آپ کا خط نہ آئے گا تفصیل معلوم نہ ہونے سے طبیعت بے چین رہے گی۔ میں نے خان بہادر کو آج تار دیا ہے اور دو خط بھی اب بھیجتا ہوں۔ یقین ہے کہ وہ میری درخواست منظور کریں گے۔ ورنہ بہ مجبوری مجھکو وہاں آنا پڑے گا۔ اس لئے کہ بجٹ کا طیار کرنا اور رپورٹ لکھنا اور قبل بند ہونے کالج کے چیکوں پر دستخط کرنا اور ضروری کاموں کا انجام دینا لازمی ہے میں مروں یا جیوں مجھے آنا پڑے گا اور اس گرمی میں آنا میرے لئے کیسا خطرناک ہے۔

حرفت و صنعت کی ممبری کانفرنس پر جو انتخاب خان بہادر کا کیا گیا، وہ نہایت موزوں اور مناسب اور ٹھیک تھا۔ اسی رائے پر میں قائم ہوں اِس میں مجھسے کچھ غلطی نہیں ہوئی۔ جیسا کہ میں نے اپنے خط میں خان بہادر کو لکھ دیا ہے اگر ٹرسٹی یہ چاہتے ہیں کہ ہر ایک چھوٹی بڑی بات اُن کے سامنے پیش کی جائے میں ایسا کرنے پر خوش ہوں۔ میں خود مختاری نہیں چاہتا اور جتنے دِن میں اس کام پر ہوں اور رہوں گا اپنے آپ کو سکریٹری سمجھ کر ہر ایک چیز ٹرسٹیوں کے سامنے پیش کر دیا کروں گا۔ اور کثرت رائے سے جو فیصلہ ہوگا۔ اُسے جاری کر دیا کروں گا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ

۱۔ مزمل اللہ خاں

۲۔ صاحب زادہ آفتاب احمد خاں

M.M.
Doc. No.13
15 July 1907
Reg. No. 8

اب کالج سنبھل نہیں سکتا اور ایسی بیماریاں پیدا ہوگئیں ہیں جن کا بظاہر علاج نہیں ہے۔ اور مجھے تو درحقیقت طاقت بھی نہیں رہی کہ میں اس بھاری بوجھ کو اُٹھا سکوں۔ کالج کی تعطیل دسویں نومبر تک کی گئی منظوری ہوتی ہے مجھے تو کچھ خبر نہیں ہے۔ نہ میں اتنی لمبی تعطیل پسند کرتا ہوں۔ تین مہینے کی تعطیل کچھ کم نہیں ہے کہ اس پر اور اضافہ کیا جارہا ہے بہرحال پرنسپل صاحب کی تجویز ان ٹرسٹیز کے سامنے پیش کردی جائے جو بجٹ کے بنانے کے لئے جمع ہوں گے۔ بعد اس فضیحت سکریٹری کی ہوچکی ہے، اب ایسے کام جائز نہیں رکھے جاسکتے اس کی اطلاع تحریری سکریٹری کو ہونا چاہیئے، تاکہ آخر حکم اس کا اُس پر ہو آپ پرنسپل صاحب سے بحوالہ میری اس تحریر کے کہہ دیجئے۔

براہ مہربانی کلن کو کرایہ ریل دے کر فوراً روانہ کردیجئے اور گاڑی کے لئے جس چیز کی ضرورت ہو دلوا دیجئے تاکہ خراب نہ ہونے پائے۔

محسن الملک

بعد ملاحظہ واپس یافتم

۱۶/جولائی ۰۷ء

۲

M.A.O.COLLAGE
Aligarh.

۲۰ رنومبر ۱۹۰۷ء

بحضور خاں بہادر صاحب

بعد تعظیم تسلیم عرض ہے۔ والا نامہ بابت وظائف کے شرف صدور ہوا۔ تعمیل ارشاد بہت جلد ہوگی۔ میں خود بھی عرض کرنے والا تھا اور میزان وغیرہ لگا رہا تھا۔ بحمد اللہ جناب والا نے غریب طلبا کے حال پر رحم فرمایا جیسی کہ امید تھی۔

عربی کے وظائف کے متعلق میں نے حسب الحکم جناب کے پرنسپل کو لکھ دیا تھا کہ پہلے سال چالیس روپے تک اور دوسرے سال پچاس روپے تک وظیفہ فی طالب عالم دیا جاوے۔ پرنسپل صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ انہوں نے ماہوار اردو طالب علموں کو دیے ہیں۔ اگر اس پر طلبا راضی ہو گئے ہیں تو بہت اچھی بات ہے ورنہ اگر وہ اور زیادہ کے خواہشمند ہوں گے تو مطلع کروں گا۔

اب تک شرط، بی، اے پاس کی رہی ہے لیکن ڈاکٹر ہورووٹز ایک ایسے طالب علم کی اب سفارش کرتے ہیں جو انگریزی مطلق نہیں جانتا۔ ان کا اور پرنسپل صاحب کا خط ارسال ہے۔ آپ غالباً منظور فرمائیں گے۔ میرے خیال میں منظوری مشروط ہونی چاہئے اورینٹل فیکلٹی کی سفارش پر صرف ڈاکٹر ہوروز کی سفارش کافی نہیں ہونی چاہئے۔ یہ محض

کارروائی چاہے گا کرے گا اور پرنسپل صاحب اس لئے کہ وہ کسی کو ناراض نہیں کرنا چاہتے، ہر شخص کی مان لیں گے تو آئندہ بھی ایسی خرابیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے آپ مجھے باضابطہ حکم دیجئے کہ میں کوئی اس قسم کی کارروائی بغیر منظوری آنریری سکریٹری نہ کروں۔ زبانی لوگ، مانتے نہیں اور ناخوش ہوتے ہیں اور جب پرنسپل صاحب لوگوں کے ناخوش و ناراض ہونے سے ڈرتے ہیں تو میں ان کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتا ہوں۔ زیادہ کیا عرض کروں؟

دوسرا امر یہ ہے کہ قبل جناب کے خط آنے کے ٹول صاحب نے فوڈ کمیٹی کر کے ایک شخص کو مقرر کرلیا جس کی سفارش حکیم اجمل خاں صاحب (۱) نے کی تھی۔ چوں کہ کمیٹی اور تقرر دونوں ہوگیا تھا اس لئے میں نے ٹول صاحب کو خط نہیں لکھا جیسا کہ جناب نے کل ہدایت فرمائی ہے۔ اب جو حکم ہو اس پر عمل کیا جائے۔

والتسلیم

خاکسار

ابوالحسن

☆☆☆

M.E.C.
Register No.37

ڈاک بنگلہ،
فتح گڑھ، ۱۸؍جولائی ۱۹۰۹ء

جناب والا نواب صاحب،

کل شام کو قریب ساڑھے چار یا پانچ بجے کے آپ کا تار پہونچا جس کے مضمون سے مجھ کو ایک گونہ تشویش ہوئی۔ اس تار کا جواب میں نے اسی وقت دے دیا کہ کل تک میں یہاں ٹھہروں گا، ابوالحسن صاحب کو یہیں بھیج دیجئے۔ یہاں ٹھہرنے کا میں پیشتر ارادہ کر چکا تھا کیونکہ آج اتوار ہے اور اس وقت کانفرنس کی لوکل کمیٹی کا جلسہ ہونا تجویز ہوا ہے۔

میں نے کل ساڑھے سات بجے ایک تار ارجنٹ ابوالحسن صاحب کو کاسگنج کے اسٹیشن کے پتہ سے اس خیال سے دیا کہ شاید وہ اس ریل سے کاسگنج پہونچیں جو ہاتھرس سے ساڑھے نو بجے چلتی ہے اور کاسگنج بارہ بجے پہونچتی ہے۔ اس لئے میں نے براہ راست کاسگنج کو اس مضمون کا تار دیا کہ وہ سیدھے یہاں چلے آویں مگر وہ آج صبح نہیں آئے کیونکہ اگر اس ریل سے وہ آتے تو آج پونے چھ بجے صبح پہونچ جاتے۔ اب میں بارہ بجے کی گاڑی میں ان کا انتظار کروں گا اور اس کے بعد ڈیڑھ بجے کی گاڑی میں روانہ ہو کر ساڑھے پانچ بجے شام کو انشاء اللہ کاسگنج پہونچوں گا۔

مجھکو کل سے برابر یہ خیال ہے کہ کس معاملہ میں اس قدر جلد مشورہ کی ضرورت ہے۔ جہاں تک میں غور کر سکتا ہوں ضرور یہ ہی ہوگا کہ موجودہ اختلافات کے متعلق گورنمنٹ سے کوئی تحریر آئی ہو یا خان بہادر مزمل اللہ خان صاحب نے آگرہ میں جو کچھ گفتگو کی ہو اس کا نتیجہ کچھ ہوا ہو۔ بہر حال مجھکو فکر ہے اور جب تک اصلی حال معلوم نہ ہو جاوے گا اس وقت تک فکر رہے گی۔

میں مقدمات میں اس قدر پھنسا ہوں کہ مجھکو سخت اندیشہ ہے کہ شاید ۱۲؍ماہ

حال کو بھی علی گڑھ نہ پہونچ سکوں گا کیونکہ جو مقدمہ ۱۹ر یعنی کل کو شروع ہونے والا ہے اس کی نسبت میرا خیال ہے کہ اس کا دو روز میں ختم ہونا مشکل ہے اور سیشن کے مقدمہ کو جب تک وہ ختم نہ ہو جائے بیچ میں چھوڑا نہیں جا سکتا۔ اگر ایسا ہوا اور میں ۱۲ر کو نہ پہنچ سکا تو میں جناب سے دو درخواستیں کروں گا۔ اول تو یہ کہ جناب مسٹر جمال سے خواہش کریں کہ براہ مہربانی وہ ۲۲ر کو اور قیام فرماویں اور اگر وہ ایسا نہ کر سکیں تو جناب ان سے کانفرنس کے دفتر کے معاملہ میں خود گفتگو فرماویں اور دفتر کانفرنس میں ان کو لے جا کر اس کی حالات دکھلا دیں اور جو رپورٹ ان کے لئے مجلد طیار کرائی ہے ان کو پیش فرما دیں۔ نیز کانفرنس کے پریسیڈینٹ کے مسئلہ کے متعلق ان سے گفتگو فرمائیں کہ ان کے خیال میں کون ہونا چاہئے کیونکہ اب زیادہ وقت باقی نہیں ہے اس کا تصفیہ جلد ہونا چاہئے۔ براہ مہربانی ۲۰ر تاریخ کو مسٹر جمال کے پہنچنے پر مجھکو جناب تار سے اطلاع دیں کہ وہ کب تک علی گڑھ قیام کریں گے۔

فقط

آفتاب احمد[1]

مکرر۔

میں یہ عریضہ لکھ کر بند کر چکا تھا کہ جناب کا تار مجھکو ملا جس سے معلوم ہوا کہ مسٹر جمال آج کلکتہ سے روانہ ہوں گے اور جس کے معنی یہ ہیں کہ شب کو علی گڑھ پہونچیں گے اور ایسی حالت میں ان کے متعلق جلسہ پرسوں ہوگا۔

میرا مقدمہ کل سے شروع ہوگا۔ میں کل جج سے عرض کروں گا کہ اس مقدمہ کو ایک روز کے لئے وہ ملتوی کر دیں اور ۲۰ر تاریخ کو وہ نہ لیں۔ اگر اس نے مان لیا تو میں ضرور جاؤں گا، ورنہ مجبوری ہے۔ امید کم ہے کہ وہ مان لے گا کیونکہ سیشن کے مقدمات ہیں اسیر باہر سے آتے ہیں اور گواہ بھی موجود رہتے ہیں۔ بہر حال میں

۱۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں

کوشش کرں گا ورنہ میں پہلے عریضہ میں جناب سے عرض کر چکا ہوں۔ باقی چند اور ضروری امور ہیں جن کو یقیناً مسٹر رفیق سے گفتگو کرنا ہے اور میں نے ادریس احمد صاحب کولکھدیا ہے کہ وہ ان سے گفتگو کریں مجھکو اپنی غیر موجودگی کا نہایت افسوس ہے مگر مجبوری ہے۔

علی گڑھ

۴رفروری ۱۹۱۳ء

حضور والا۔ تسلیم عرض ہے۔آج دوتار جناب کی خدمت میں نواب صاحب کی طرف سے گئے ہیں۔ایک اونئل کمیشن کے سوالات کے جوابات کی کمیٹی کے اجلاس کے متعلق کہ ۶رفروری کو بعد مغرب نواب صاحب کی کوٹھی پر جلسہ ہے۔اس میں جناب کی شرکت ضروری ہے۔

دوسرے امیدواران کی طرف سے امپیریل کونسل میں ممبر کے انتخاب کے متعلق کہ اس کی تفصیلات طے کرنے اور کام شروع کرنے کے لئے جناب کی یہاں فوراً موجودگی ضروری ہے۔

منسلکہ گزٹ سے جناب کو معلوم ہوگا کہ ۱۳رفروری کو نام زدگی کی تاریخ ہے اور ضروری انتخاب کی تاریخ ہے۔وقت بہت کم ہے اور کام زیادہ کرنا ہے۔اور جب کہ جناب کا نام نامی اس درمیان میں آ گیا ہے تو کوشش پوری کرنی چاہئے۔آج ابھی ایک خط آنریبل سید عبد الرؤف صاحب(۱) کو بھی لکھا ہے۔ اطلاعاً عرض ہے۔نواب صاحب امید رکھتے ہیں کہ کل ہی جناب والا ضرور تشریف لائیں گے۔

(۲)والتسلیم مع اللہ

خاکسار

ابوالحسن

مجھ کو امیدداری منظور نہیں

مزمل اللہ

Hotel Kashmir
Mussoorie
18. 5. 34.

مشفق و مکرم بندہ ۔ آداب عرض ہے ۔ مزاج اقدس

بخیر ۔ یہاں موسم شاید جا چکا ہے ۱۳ ۔ تک مئی کی سیل رکا ۔ چند ہفتہ میں

رخصت ملک ہوجائے گی ۔ انشاء اللہ آخر جون تک واپسی ہوسکے گی ۔

بچی سعیدہ کا علاج ان کی صحت اب بالکل صاف ہو گئی ہے

ضعف قلبی بہت ہو گیا ہے تا ہم امید ہے کہ اس علاج سے رفع ہو جائے گا ۔

یہاں سردی کم ہوگئی ہے موسم نہایت خوشگوار ہے ۔ مسوری اس سال

نسبتاً خالی ہے ۔ لوگ کم آئے ہیں ۔ خیال ہے کہ جون میں

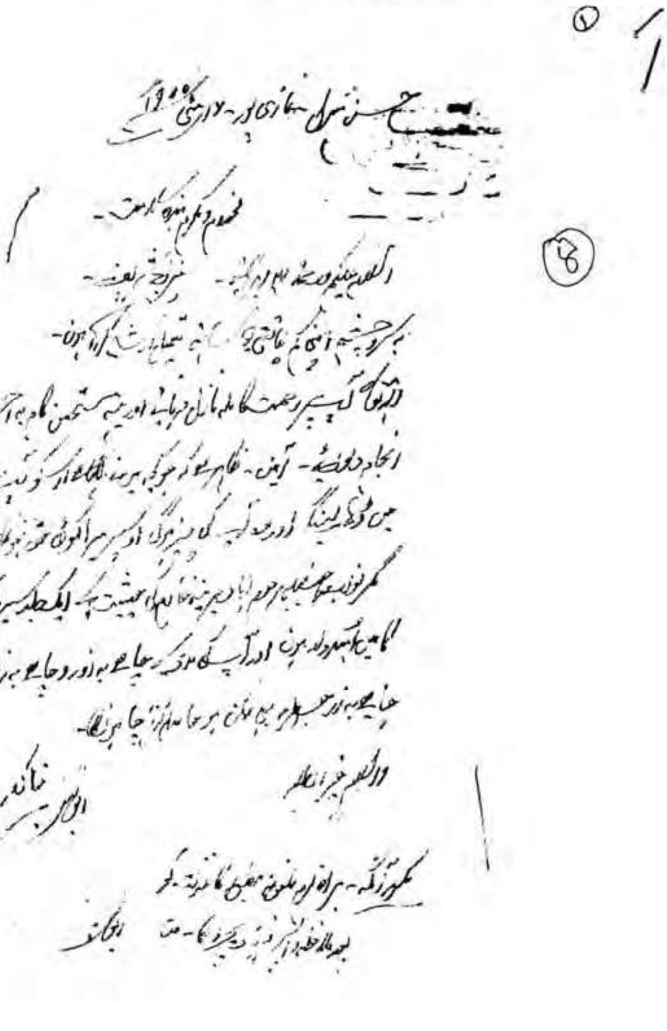
لوگ زیادہ آجائیں گے ۔

امید ہے جناب کا مزاج بخیر ہوگا ۔

نیازمند

ابوالحسن

نوٹ: نواب مزمّل اللہ کے نام مولوی ابوالحسن کے تفصیلی خط کا عکس۔
خط کے اختتام پر اس کی کمپوزنگ بھی شامل کی گئی ہے۔



(۷)

۲۳۶

خدا کا شکر ہے کہ اوس نے اپنے فضل و کرم سے مجھ کو پھر [illegible]
مرحوم مغفور [illegible] کے متعلق جو کچھ اپنی دوری [illegible] کیسے جانتا ہوں وہ مفصلاً تحریر میں لا سکوں - لیکن افسوس [illegible]

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار گلچین بہار تو ز داماں گلہ دارد

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

جناب نواب صاحب مرحوم کی علمی قابلیت اور دینی شغف کے متعلق [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

دوسرا ایک بار اس وقت نواب وقار الملک بہادر کے زمانہ میں وہ آیا جبکہ سر آرچبولڈ پرنسپل کالج نے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

(3)

[illegible]

۳۱

[illegible]



(5)

حسن منزل غازی پور، 16 مئی 1955ء

محترم ومکرم بندہ سلامت،

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ، مزاج شریف،

بہ سروچشم اپنی کم لیاقتی کے ساتھ تعمیلِ ارشاد کررہا ہوں۔

اللہ تعالیٰ آپ پر رحمتِ کاملہ نازل فرمائے اور یہ مستحسن کام بہ احسن وجوہ انجام دلوائے۔ آمین۔ ظاہر ہے کہ جو کچھ مَیں نے لکھا ہے اوس کو آپ بہتر قالب میں ڈہالیں گے اور وہ آپ کی چیز ہوگی، اوس پر میرا کوئی حق نہ ہوگا۔

مگر نواب صاحب قبلہ مرحوم کے دیرینہ خادم کی حیثیت سے ایک جلد سیرت شریف کا مَیں اُمیدوار ہوں اور آپ کی مدد سے چاہے بہ زور چاہے بہ زاری اور چاہے بہ زر، جس طرح بھی ممکن ہو حاصل کرنا چاہوں گا۔

والسّلام خیر الطلب،

نیاز مند

ابوالحسن

مکرر آنکہ: براہِ کرم ملفوفہ مطبوعہ کاغذات کو

بعد ملاحظہ واپس فرمادیجئے گا۔ ابوالحسن

☆

خدا کا شکر ہے کہ اوس نے اپنے فضل و کرم سے مجھ کو یہ موقع عطا فرمایا ہے کہ مَیں اپنے محسنِ اعظم الحاج نواب محمد مزمل اللہ خان بہادر مرحوم مغفور رئیس بھیکم پور ضلع علی گڑھ کے متعلق جو کچھ اپنی ذاتی واقفیت سے جانتا ہوں وہ ضبطِ تحریر میں لا سکوں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ:

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حُسن تو بسیار
گل چیں بہار تو ز داماں گِلہ دارد

ایک تو میرے قلم میں قدرت نہیں کہ کما حقہٗ اس کام کو انجام دوں، دوسرے 80 برس کی عمر ہو جانے سے پیری و صد عیب میں مُبتلا ہو گیا ہوں۔ منجملہ اون کے ایک یہ ہے کہ حافظہ بالکل ہی خراب ہو گیا ہے اور پچھلی بہت سی باتیں بھول گئی ہیں۔ اوس پر مستزاد آنکھوں کی روشنی اس قدر کم ہو گئی ہے کہ نہ پُرانی یادداشتیں اچھی طرح پڑھ سکتا ہوں نہ آسانی کے ساتھ کچھ زیادہ لکھ سکتا ہوں۔ کاش اس خوشگوار کام کا موقع دس بارہ برس قبل ملا ہوتا تو ممکن تھا کہ جناب مولانا نواب صاحب ممدوح کی شان کے شایان کچھ زیادہ عرض کر دیتا۔ بہرحال

نہ ہو تابِ پرواز گر آسمان تک
تو اوڑے رسائی ہو اپنی جہاں تک

پر عمل کرتا ہوں۔

جناب نواب صاحب قبلہ کی علمی قابلیت اور دینی شغف کے متعلق کچھ عرض کرنا میرے لیے بہت چھوٹا منہ اور بہت بڑی بات ہے۔ جو کچھ دیکھا ہے وہ یہ تھا کہ وہ انگریزوں سے بے تکلف انگریزی زبان میں بات چیت کر لیتے تھے اور دیر تک اور جب ہز مجسٹی امیر حبیب اللہ خان شاہ افغانستان سے علی گڑھ تشریف لائے تھے تو اُن سے فارسی میں خوب گفتگو فرماتے تھے جس کو میں حیرت سے سُنتا اور دل ہی دل میں خوشی سے داد دیتا تھا۔ بعض عرب سیاحوں سے رواں عربی میں کلام کرتے ہوئے بھی دیکھا اور اُن کی ہمہ گیری پر تعجب کیا لیکن خود عربی سے بالکل نابلد ہونے کی وجہ سے داد دینے سے قاصر رہا۔

مَیں نہایت فخر کے ساتھ اس شرف کا اظہار کرتا ہوں کہ پورے دس برس تک بطور خاص ماتحت کے مجھ کو جناب نواب صاحب قبلہ کی نگرانی میں اون کی ہدایتوں کے مطابق علی گڑھ کالج کی اہم خدمات انجام دینے کا موقع ملا تھا جبکہ میں تنخواہ دار اسسٹنٹ سکریٹری کالج کا تھا اور نواب صاحب ممدوح آنریری جوائنٹ سکریٹری ٹرسٹیان تھے۔ جناب نواب صاحب قبلہ کی حاضر دماغی، فراستِ ذہنی، سمجھ بوجھ کی دوررسی اور انتظامی معاملات میں عملی قابلیت کسی طرح نواب صاحب محسن الملک مرحوم سے کم نہ تھی۔ یوں تو کالج اور قوم کے مفاد کے معاملات میں نواب مزمل اللہ خان مرحوم نے اپنے تدبر اور سیاست سے نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک آنریری سیکریٹری صاحبان کی اکثر گتھیاں سلجھائی تھیں مگر دو واقعات کی تفصیل پر اس وقت اکتفا کرتا ہوں۔ 1906ء میں جبکہ نواب محسن الملک نے مسلم لیگ کی بنیاد ڈالنے کے لئے گورنمنٹ آف انڈیا میں ڈیپوٹیشن لے جانے کی تجویز کی تو اُس وفد کی صدارت کے لیے کوئی مناسب شخص اُن کے ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ اس وقت نواب مزمل اللہ خان بہادر نے ہز ہائینس سر آغا خان کا نام تجویز کیا جو ہندوستان میں موجود نہ تھے اور نہ معلوم کہاں کھلے سمندر میں اپنا خاص جہاز پانی پر چلا رہے تھے اور طبی مشورہ کے مطابق اپنی تندرستی قائم کرنے کے لیے سمندر کی ہوا کھا رہے تھے۔ بہرحال نواب صاحب قبلہ کے مشورہ پر ایک بہت بڑا تار مختلف مقامات پر دیا گیا جو ہز ہائینس کو ڈیپوٹیشن کے شملہ پہنچنے کی تاریخ سے ایک ہفتہ قبل کہیں ملا اور وہ فوراً رنگون پہونچے اور اسپیشل ٹرین کر کے وقت سے صرف چند گھنٹے قبل شملہ پہونچ گئے اور یہ قومی مشکل یوں حل ہوئی جس کا سہرا نواب مزمل اللہ

خان بہادر کے سر رہا۔

دوسرا ایک نازک وقت نواب وقار الملک بہادر کے زمانہ میں آیا جبکہ مسٹر آرچبولڈ پرنسپل کالج نے آنریری سیکریٹری کالج کے خلاف صوبہ کی گورنمنٹ میں احتجاج کیا اور قومی اندیشہ پیدا ہوگیا کہ اگر آرچبولڈ صاحب کوزک ہوئی تو صوبہ کے لفٹیننٹ گورنر بہادر ناراض ہوجائیں گے اور کالج کی پیٹرن شپ سے علیحدہ ہوجائیں گے جس کا اثر کالج کی بیرونی امدادوں پر بُرا پڑے گا اور کالج کو سخت نقصان پہنچے گا۔ مگر نواب وقار الملک کی ہردلعزیزی اور آرچبولڈ کی بے راہ روی کا اثر ساری قوم پر ایسا پڑا کہ جو ٹرسٹی صاحبان ملازمانِ گورنمنٹ تھے انہوں نے اپنی نوکری کی بھی کچھ پروانہ کی اور کھلے ووٹ پرنسپل کے خلاف تحریراً بھیج دیئے۔ اس مسئلہ کے طے کرنے کے لیے جو خاص اہم جلسہ ٹرسٹی صاحبان کا منعقد ہوا اس میں بھی ملازمینِ سرکار بلا پس وپیش کے شریک ہوئے اور ننانوے فی صدی نے نواب وقار الملک پر اظہارِ اعتبارِ کلی کیا اور ہر چہ بادا باد کہہ کر آرچبولڈ صاحب کے خلاف رزولیوشن پاس کرنے پر آمادہ ہوگئے اور قریب تھا کہ تنکہ توڑ کارروائی عمل میں آجاتی اور برتر از دست رفتہ ہوجاتی اور کچھ بات بنائے نہ بنتی اور نہ معلوم کالج پر کیا مصیبت آتی۔ اس وقت بھی نواب مزمل اللہ خان بہادر نے دوراندیشی سے کام لیا اور یہ مشکل بھی بہ احسن وجوہ حل ہوگئی۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ نواب صاحب قبلہ نے یہ بروقت تجویز پیش کردی کہ جلسہ بغیر کسی قطعی فیصلہ کے ملتوی کردیا جائے اور ایک وفد لاٹ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر اُن سے بحیثیت (پیٹرن) کالج کے مشورہ اور ہدایت طلب کرے کہ ٹرسٹیان کالج کو کیا کرنا چاہیے۔ سب لوگوں نے اس تجویز کو پسند کیا اور قرار پایا کہ نواب فیاض علی خان صاحب صدر اور نواب صاحبان سیکریٹری وجوائنٹ سیکریٹری ٹرسٹیان تمام کاغذات وغیرہ لے کر گورنمنٹ ہاؤس میں حاضر ہوں اور لاٹ صاحب سے گفتگو کریں۔ مَیں بھی بحیثیت اسسٹنٹ سیکریٹری تمام متعلقہ کاغذات وروئیدادیں وغیرہ لے کر اس نمائندہ وفد کے ساتھ گورنمنٹ ہاؤس میں گیا اور لاٹ صاحب کے پرائیویٹ سیکریٹری کے بغل والے کمرہ میں بیٹھا رہا۔ لاٹ صاحب سے گفتگو کرنے میں زیادہ تر حصہ نواب مزمل اللہ خان بہادر ہی کا تھا اور اون کی طلاقتِ لسانی میں مولف القلوب نے وہ اثر پیدا کیا کہ لاٹ صاحب کا میلانِ طبع استوار ہوگیا۔ انہوں نے اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا

اورنواب صاحبان کواطمینان دلایا کہ کالج کوکوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ قصہ مختصر یہ کہ لاٹ صاحب کا منشاء پا کر آرچبولڈ صاحب نے خود ہی کالج سے علیحدگی اختیار کر لی اور جلد ہی یہ ہوا کہ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت۔ اورنواب صاحب کے باموقع تدبر سے آرچبولڈ صاحب بھی عزت وآبرو کے ساتھ چلے گئے اورنواب وقار الملک بہادر بھی بحالہ قائم رہے۔

یہ دوواقعے بطور مشتے نمونہ ازخروارے مثالاً پیش کرنے کے بعد مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ نواب محسن الملک بہادر ہر سال گرمی وبرسات میں تقریباً چھ مہینے بمبئی میں تشریف رکھتے تھے اور کالج کا کام کلیتہً نواب مزمل اللہ خان بہادر ان کی غیر موجودگی میں بہ احسن وجوہ انجام دیتے تھے۔ ابتدائی زمانہ میں انتظامی کمیٹی کا نام بورڈ آف مینجمنٹ تھا جس کے صدر پرنسپل صاحب ہوتے تھے اور آرچبولڈ کے وقت میں ان کی وجہ سے بعض وقت ایسی گتھیاں پڑ جاتی تھیں کہ جن کا سلجھانا نواب محسن الملک بہادر کو بوجہ ان کی خلقی مروت اور انگریزوں کی پاسداری کرنے کے مشکل ہوتا تھا۔ ایسے وقتوں میں نواب مزمل اللہ خان صاحب ہی کی حکمتِ عملی کام کر جاتی تھی اور سانپ بھی مرجاتا تھا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹتی تھی۔

اس کی دو ایک مثالیں خود میرے حسبِ حال ہیں جن کا ذکر شاید بے موقع نہ ہوگا۔ پہلا واقعہ یہ ہے کہ 1905ء میں جبکہ مَیں کالج میں سائنس کا پروفیسر تھا اور صرف 110 روپیہ ماہوار تنخواہ پاتا تھا۔ رائے پور ممالک متوسط میں 175 روپے ماہوار پر بطور نائب پرنسپل ہو کر چلا گیا اور گویا علی گڑھ کو خیر باد کہہ گیا۔ چنانچہ نواب محسن الملک مرحوم نے 5 جولائی 1905ء اپنے اخبار انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں بہ ایں الفاظ میرے جانے پر یوں افسوس ظاہر کیا۔

> ”کالج کو ان کے چلے جانے سے سخت نقصان پہنچے گا اور ان کا قائم مقام ملنا نہایت مشکل ہوگا۔ افسوس کہ کالج انہیں نہ رکھ سکا اور ایسے لائق وہونہار جوان کو اپنے ہاتھ سے کھو دیا۔ افسوس کہ کالج ترقی کے مدارج قائم نہ کرنے سے لائق آدمیوں کی خدمت سے محروم ہوتا جاتا ہے“۔

اس کے علاوہ نواب صاحب نے اپنے کرم اور نوازش سے میرے متعلق اور بہت سے شاندار

الفاظ استعمال فرمائے تھے جو مَیں نے نقل کرنے میں حذف کر دیئے ہیں۔ بہر حال جہاں تک مجھ کو بعد کے حالات معلوم ہوئے وہ یہ ہیں کہ نواب محسن الملک بہادر کو میرے واپس بلانے کی فکر تھی اور نواب مزمل اللہ خان بہادر نے ان کو یہ صورت سوجھائی کہ ہز ہائینس آغا خان سے پانچ سو روپیہ ماہوار کی امداد اس شرط کے ساتھ حاصل کی جائے کہ اس میں سے تین سو روپیہ ماہوار پر ایک عہدہ اسسٹنٹ سیکریٹری کالج کا قائم کیا جائے۔ چنانچہ یہ صورت کامیاب ہوئی اور مجھ کو یہ پیغام میرے دوستوں کے ذریعے پہنچا کہ مَیں وہاں چلا آؤں اور اس جدید عہدہ کو قبول کرلوں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں اور مَیں آنکھیں بند کر کے چلا آیا کیونکہ وہاں غریب الوطنی تھی اور علی گڑھ سے دل کو وطن سے بھی زیادہ وابستگی تھی۔ مگر وائے بر حالِ من کہ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ اس خوشنما باغ میں گلِ دیگر شگفت کا مضمون پیدا ہو گیا ہے۔ وہ اس طرح کہ جناب صاحبزادہ آفتاب احمد خان صاحب مرحوم جو اس وقت ایک بہت مقتدر اور بااثر ٹرسٹی تھے، اپنے کلاس فیلو اور خاص دوست منشی عنایت اللہ مرحوم کو اس عہدہ پر فائز کرا دینا چاہتے تھے۔ درآنحالیکہ نواب محسن الملک بہادر کی دلی خوشی مجھ کو اپنی ماتحتی میں لینے کی تھی مگر یہاں بھی ان کی خلقی چشمِ مروت اس معاملہ میں بھی صاحبزادہ صاحب کے سامنے جھکی جارہی تھی اور اس وقت بھی نواب صاحب موصوف نے نواب مزمل اللہ خان بہادر ہی کی تائید چاہی جنھوں نے کسی طور پر صاحبزادہ صاحب کی تجویز کی مخالفت فرمائی اور باوجود اس کے کہ آرچیبولڈ صدر جلسہ، صاحبزادہ صاحب کی تائید میں تھے اور نواب محسن غیر جانب دارانہ طریقہ پر خاموشی اختیار کئے ہوئے تھے۔ نواب مزمل اللہ خان نے ممبران بورڈ کی کثرتِ رائے اپنی تائید میں حاصل کرلی اور مَیں مقرر ہو گیا جس کا افسوس ناک نتیجہ میرے لیے یہ ہوا کہ صاحبزادہ صاحب اور آرچیبولڈ مستقل طور پر میرے تقرر سے بیزار ہوئے اور مجھ کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ''دشمن اگر قوی است نگہبان قوی تر است'' ثابت ہوتا رہا اور اللہ تعالیٰ نے نواب مزمل اللہ خان بہادر کی سرپرستی میں مجھ کو ہر بلا سے محفوظ رکھا اور جس ترقی کی امید دلا کر مجھے واپس بلایا گیا تھا اُس سے بھی زیادہ خاص خاص ترقیاں مجھ کو برابر ملتی رہیں اور دس برس بعد جب 1916ء میں نواب اسحاق خان مرحوم کی سفارش پر مَیں ملازمتِ سرکاری میں انسپکٹر مدارس مقرر ہوا اس میں بھی نواب مزمل اللہ خان مرحوم ہی کا عملی مشورہ شاملِ حال تھا جس نے ڈیلامونس ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم کو

مجھ سے ہموار کر دیا۔ جذبۂ تشکر و امتنان کا تقاضہ ہے کہ نواب صاحب ممدوح نے جو وقتاً فوقتاً میری سفارشات میں میری ناچیز خدمات کی قدر افزائی میں میرے متعلق شاندار الفاظ استعمال کئے ہیں ان کو نقل کر کے ان کی صفتِ بندہ پروری کو آشکار کروں مگر چونکہ اس میں خود ستائی کا پہلو نکلتا ہے لہٰذا طبعِ سلیم مانع آتی ہے اور کہتی ہے کہ نواب صاحب کے اوصاف کا ذکر دوسروں کے سلسلہ میں لانا زیادہ مناسب ہے۔ بہر حال ان الفاظ کی مستند نقل میرے ہاں موجود ہے اور وہ میرے لیے سرمایۂ فخر و مباہات ہے۔ ان کی اصل دفتر آنریری سیکریٹری کے پرانے مسلان میں جن کو دیکھنا ہو وہ دیکھ سکتا ہے۔

ایک مہتمم بالشان واقعہ مری ذاتی واقفیت کا اور ہے جس کو یہاں ذرا تفصیل کے ساتھ لکھنا چاہتا ہوں اور جس سے معلوم ہوگا کہ نواب صاحب ممدوح کو بطور ایک سعید شاگردِ رشید کے اپنے استاد مولانا شیخ حسین عرب کی خاطر کس قدر عزیز تھی کہ جس پر وہ اپنے مذہبی جذبات کو بھی قربان کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ مگر خدا نے ان کے استاد کے علم و فضل کی اور نواب صاحب کے جذبات دونوں کی لاج رکھی اور جو بات بظاہر ناممکن معلوم ہوتی تھی وہ مولانا سیّد سلیمان اشرف صاحب نے طلاقتِ لسانی کے ذریعہ ممکن کر دکھائی۔ فَتَبَارَکَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ ، واضح باد کہ شیخ حسین عرب صاحب اہلِ حدیث فرقہ کے بزرگ تھے جو میلاد شریف میں قیام کے خلاف سمجھے جاتے تھے اور انہوں نے کسی وقت میں نواب مزمل اللہ خان اور نواب حبیب الرحمٰن خان شروانی کو حدیث کا درس دیا تھا۔ ان کی عمر نوے برس سے بھی متجاوز تھی اس وقت جب کا یہ واقعہ ہے، نواب مزمل اللہ خان بہادر نے ایک مرتبہ بہت خاص اہتمام سے محفلِ میلاد شریف کا انعقاد کیا جو وہ ہر سال علی الصباح قبل طلوعِ آفتاب کیا کرتے تھے اور اپنے تمام اعزہ اور قرب و جوار کے رؤسا کو یہ کہہ کر مدعو کیا کہ مولانا سیّد سلیمان اشرف صاحب مرحوم کا بیان ہوگا جن کا وعظ سننے کو ہر شخص مشتاق رہتا تھا۔ عصر کے وقت نواب صاحب کا موٹر علی گڑھ پہنچا اور مجھ کو حکم تھا کہ مولانا صاحب ممدوح کو ساتھ لے کر بھیکم پور پہنچاؤں۔ چنانچہ اس کی تعمیل ہوئی اور وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ شیخ صاحب موصوف بے سان و گمان اور بغیر پہلے سے اطلاع کے حبیب گنج پہنچ گئے ہیں اور دوسرے روز علی الصباح نواب صدر یار جنگ اور حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی ایک ساتھ

محفلِ میلاد شریف میں شریک ہونے کے لئے تشریف لائیں گے۔اس سے قلعہ بھیکم پور میں ایک کھلبلی مچ گئی جہاں نوے فی صدی شیخ صاحب کے ہم خیال تھے۔قیامِ میلاد شریف کی مخالفت میں۔اورنواب مزمل اللہ خان بہادر ایک فکر میں مبتلا ہو گئے کہ اب کیا کیا جائے۔ایک طرف بیان کرنے والے حنفی عالم کا لحاظ جو قیام کو ضروری خیال فرماتے تھے،دوسری طرف استاد کا پاسِ خاطر جو قیام کے خلاف سمجھے جاتے تھے۔بالآخر استاد کا پلہ بھاری ثابت ہوا اور نواب صاحب کا منشاء یہ معلوم ہوا کہ قیام نہ ہو جس پر مولانا سیّد سلیمان اشرف صاحب بہت مشکل سے میرے اس کہنے پر راضی ہوئے کہ مولانا آپ تو از اوّل تا آخر اور از ابتدا تا انتہا برابر کھڑے ہو کر وعظ فرماتے ہیں۔ آپ کے لئے تو مزید قیام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔باقی رہے دوسرے لوگ ان کے لیے آپ خدائی فوجدار کیوں بنیں۔ان کو ان کے حال پر چھوڑیئے جو قیام کرے گا اجر حاصل کرے گا ورنہ خود خمیازہ بھگتے گا۔مَیں نے اپنے اور اپنے کم از کم ایک درجن دوستوں کے متعلق یقین دلایا کہ ہم لوگ انشاء اللہ ضرور قیام کریں گے چاہے کوئی کرے یا نہ کرے مگر مشیّتِ ایزدی کچھ اور بھی زیادہ ثابت ہوئی یعنی جبکہ قرعہ فال بنام حقِ دیوانہ زدند ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اس کو سولہ آنے نیک فال قرار دے دیا۔ سبحان اللّٰہ وبحمدہٖ اور اگرچہ ایک طرف نازک مزاج یار تھا اور دوسری طرف نازک تر دل تھا مگر تائیدِ غیبی میرے ساتھ ہوئی اور نباہِ الفت کا ان دو نازکوں میں جو کہ بہت مشکل تھا آسان ہو گیا اور مولانا صاحب راضی ہو گئے اور راج ہٹ کو مان لیا۔لیکن اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں کچھ ایسی لو لگائی کہ آخر کار اس ارحم الرٰحمین نے انہیں کی لاج رکھی۔ ویسے تو یہ داستان لمبی بھی ہے اور پُر لطف بھی مگر یہ موقع اختصار کا بھی ہے اور مَیں معذور بھی لہٰذا صرف لبِ لباب عرض کئے دیتا ہوں۔صبح کو مولانا صاحب نے اپنا بیان اس چھوٹی سی آیت سے شروع کیا۔هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ اور لفظ احسان کی تفسیر مختلف عنوان سے بیان فرمائی جس کا مفہوم بھی بیان کرنا میرے لیے بہت مشکل ہے۔مولانا ممدوح کی فصیح البیانی اور کہاں میری کج مج زبانی۔اُس کے بعد بادشاہ،حاکم،باپ،ماں،استاد،پیرِ طریقت وغیرہ کے احسانات کی نوعیت بیان کر کے نبیوں کے حالات پر آئے اور مقابلہ کرتے کرتے یہ ثابت کیا کہ ہمارے پیغمبر ﷺ سب سے بڑے محسن بنی نوع انسان کے لیے پیدا ہوئے تھے جن کے لیے یہ کہنا

بالکل صحیح ہے کہ بعداز خدا بزرگ توئی قصہ مختصراور جن کی محبت و تعظیم میں جس قدر بھی مبالغہ کیا جائے کم ہے۔اور یہی ان کے احسانِ عظیم کا بدلہ ہوسکتا ہے۔ چنانچہ اسی جذبہ کے تحت محفلِ میلاد شریف منعقد کی جایا کرتی ہے اور خاص اہتمام روشنی، آرائش، عطریات وخوشبویات وغیرہ کا کیا جاتا ہے اور اپنے جذباتِ احترام ومحبت کا والہانہ مظاہرہ کیا جاتا ہے جو کہ ایک وجدانی کیفیت ہوتی ہے اور وہ ہر طرز پر قابلِ قبول ولائقِ اعتراف ہونی چاہیے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ہندوستان میں اور اس سے باہر تمام بلاد اسلامیہ میں محفلِ میلاد شریف کا انعقاد کرنے پر کیا کیا رواسم برتے جاتے ہیں اور اس کی تشریح اس سن رسیدہ عالم کے سامنے مفصل طور پر ان تمام مقامات یعنی روم وشام، مصر وفلسطین، دمشق، عراق کا ذکر کیا جہاں وہ سفر کر چکے تھے۔

گویا اپنی معلومات کی بنا پر شیخ حسین عرب کو یاد دلا رہے تھے اور بتا جتا رہے تھے کہ محفلِ میلاد شریف میں مسلمانوں کا کیا طرزِ عمل ہوتا تھا اور کس طرح پر وہ اپنی جماعت اور پیغمبر ﷺ کی عزت جو ان کے دلوں میں تھی اور اس طرح جذبہ محبت کو جو آنحضرت ﷺ نے ساتھ تھا، مجمع میں ظاہر کیا کرتے تھے۔ جس وقت محسنِ اعظم کی پیدائش کا بیان ہوتا تھا اور ان کے شکمِ مادر سے اس خاکدانِ عالم میں قدم رنجا فرمانے کا ذکر ہوتا تھا تو لوگ بے اختیار کھڑے ہوجاتے تھے اور کھڑے کھڑے درود وسلام پڑھتے رہتے تھے۔ اور اسی کا نام قیام ہے جو حقیقت میں وجدانی مظاہرہ اس عظمت اور عزت ومحبت کا ہے جو اس محسنِ اعظم کے احسانوں کا ادنیٰ بدلہ کہا جاسکتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کے مندرجہ بالا مختصر حکم کی تعمیل ہوسکتی ہے۔ لہٰذا ہمارے اس فعل کے جائز ہونے میں کیا عذر ہوسکتا ہے۔ اس کے بعد فوراً ہی مولانا نے آنحضرت ﷺ کے نورِ مبارک کا درجہ بدرجہ حضرت آدم سے حضرت عبداللہ تک منتقل ہونے کا بیان فرمایا اور اس کو آپ نے ولادتِ مبارکہ پر ختم کر کے درود وسلام کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے دیا جس کا مَیں اور میرے دوست انتظار کر رہے تھے۔ خدا کے فضل سے نہ صرف ہم لوگ بلکہ خود شیخ صاحب موصوف اور نواب صاحب اور ان کے ساتھ دو ہزار حاضرین کا سارا مجمع کھڑا ہو گیا اور مَیں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ پہلے مَیں کھڑا ہوا یا پہلے شیخ حسین عرب صاحب کھڑے ہوئے۔ شیخ صاحب موصوف پر ابتدائے بیان سے ہی ایک رقت طاری تھی۔ پندرہ منٹ کے بعد معلوم ہوتا تھا کہ مولانا کی نظروں سے سارا مجمع اوجھل ہو گیا ہے

اور صرف ایک معمر اور مستند عالمِ حدیث اون کے سامنے اور اون کا صحیح مخاطب ہے۔ آدھ گھنٹہ کے بعد شیخ صاحب کی آنکھیں نم ہونی شروع ہوئیں جس کا سلسلہ آخر تک قائم رہا جب تک کہ مولانا کا بیان ختم نہ ہوا۔ واللہ علم شیخ صاحب کے اندر جذبۂ ندامت کارفرما تھا یا کچھ اور مگر اس کا اختتام اس پر ہوا کہ مولانا صاحب درود وسلام پڑھ کر بیٹھنے لگے اور ادھر سے شیخ صاحب ان کی طرف یہ کہتے ہوئے بڑھے کہ ''سبحان اللہ بیان اس کو کہتے ہیں۔ ایسے بیان کو کون بدعت کہہ سکتا ہے۔'' اور آگے بڑھے اپنے دونوں ہاتھوں کو مصافحہ کے لیے بڑھایا اور مولانا کے ہاتھوں کو کچھ دیر اپنے گرفت میں بطور قدردانی کے رکھا۔ مندرجہ بالا الفاظ خود شیخ صاحب کی زبانِ مبارک سے نکلے ہوئے نقش کالحجر کس طرح میرے دل ودماغ پر اب تک چھائے ہوئے ہیں۔ جب تک شیخ صاحب مصافحہ کرتے رہے سارا مجمع دم بخود کھڑا یہ خوشنما منظر دیکھتا رہا اور میں اس مسرت وشگفتگی کو الفاظ کا جامہ پہنانے سے قاصر ہوں جو ہمارے برگزیدہ الحاج نواب سرمزمل اللہ خان بہادر کے چہرۂ مبارک سے ان کے استادِ محترم کے نہ صرف قیام کرنے بلکہ اظہارِ خیال پر نمایاں ہورہی تھی۔

میرے خیال میں نواب صاحب ممدوح کو جو استاد کی دل شکنی کا زیادہ خیال ہوا وہ یہی اللہ تعالیٰ کے اس حکم هَلْ جَزَاء الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَان کی تعمیل میں تھا۔ وہ استاد کی تعلیم کے احسان کا بدلہ اتار رہے تھے جو اللہ تعالیٰ کو اس قدر پسند آیا کہ اس نے ان کے محترم استاد ہی کی تالیفِ قلب خود ان کے مزاج کے موافق کردی اور دونوں کا مسلک ایک ہوگیا۔

والحمد لله رب العالمين۔

اللہ تعالیٰ نواب صاحب مرحوم کو ان کی دینداری اور اعلیٰ صفاتِ انسانی کا اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی ذات والا صفات پر یہ شعر پوری طرح صادق آتا تھا کہ:

افرق تا بہ قدم ہر کجا کہ مینگرم
کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجاست

خاکسار
ابوالحسن
از غازی پور

15 مئی 1955ء

نواب سر مزمل اللہ کی نظر میں مولوی ابوالحسن ان کی اپنی تحریر میں

اقتباسات متعلق یادداشت مورخہ ۲۸ر جنوری ۱۹۱۰ء

۱۔ ۷ر اپریل ۱۹۰۹ء کو ایک تحریر میں نے بجواب استفسار جناب نواب وقار الملک بہادر اس طرح
بطور یادداشت کے لکھی تھی جبکہ اسسٹنٹ سکریٹری کے عہدہ کی اصلی تنخواہ کا معاوضہ بخشش تھا
اور یہ تحریر دفتر میں بجنسہٖ موجود ہے۔ اسکے ایک فقرہ کا اقتباس ذیل میں درج ہے۔
" ابوالحسن صاحب کا تقرر اس عہدہ پر یکم جون ۱۹۰۶ء سے ہوا ہے۔ اسوقت سے جس
" خوبی خوش اسلوبی۔ محنت۔ شرافت۔ دیانت۔ امانت۔ اطاعت۔ عزت
" اور قومی محبت کے ساتھ انہوں نے یہ کام انجام دیا ہے اسکا حال مجھ کو اور جناب
" اور خود جناب والا پر خوبی ظاہر ہے اور نواب محسن الملک مرحوم کی رائے
" اور میرے زمانہ قیام مقامی کی تحریرات سے اسکی تائید ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ
" اس عہدہ کے واسطے ہر حالت کے اعتبار سے ان سے زیادہ موزوں شخص میری
" رائے میں تو ملنا اگر محال نہیں تو سخت دشوار ضرور ہے گویا کہ خداوند تعالیٰ نے
" انکو اسی خاص کام کے واسطے پیدا کیا ہے۔ پس اگر کسی اور انتظام سے
" منع نہیں ہوتا تو خاص اسوجہ سے کہ جو شخص جس قابل ہے اسکے ساتھ
" ویسا ہی سلوک کرنا چاہیئے۔ یہ لازم ہے کہ انکو برابر [illegible] سال کا
" اضافہ دیا جائے تا بحدیکہ ۳۰۰ تک ماہوار پورے ہوں اور اس کے
" گذرنے کے بعد اگر انکو اور ترقی دیجائیگی تو سمجھا جائیگا کہ ٹرسٹیان کالج نے
" ایک کارگذار کی قدر کی۔ لیکن جو پوزیشن کالج میں بلحاظ اہمیت اس
" عہدہ کے اور بلحاظ انکے ذاتی شریفانہ برتاؤ ــــ قومی محبت کے

"اسے قائم رکھنا بلکہ اسکو بڑھانا ہمارا فرض ہے اور اُس عہدہ کا
"مناسبت کار آمد ہونا اور سخت ضروری ہونا واقعہ نفس الامری ہے
"جسکو اُس شخص خاص کے تقرر نے اور بھی زیادہ خوش اسلوبی کے ساتھ
"ثابت کر دیا ہے۔

۲۔ ۱۹؍جون ۱۲ء کو میں نے ایک پرائیوٹ مراسلہ بصیغہ راز جناب نواب وقار الملک بہادر کی
خدمت میں اسوقت پیش کیا تھا جبکہ جناب ممدوح عہدہ آنریری سکریٹری شپ
کالج سے عنقریب کنارہ کش ہونے والے تھے۔ اسکا ضروری اقتباس درج ذیل ہے۔
" حضور نے آنریری سکریٹری کے عہدہ سے علحدگی کا عزم بالجزم کر لیا ہے۔ اندریں
"صورت میں آپ ایک فرض کے بارے سبکدوشی کا موقع حاصل کرنا چاہتا ہوں
"مولوی محمد ابوالحسن صاحب اسسٹنٹ سکریٹری کی ذاتی خدمات اس عہدہ کی نیز
"عہدہ اسسٹنٹ سکریٹری کا پوزیشن مجھکو اس امر کے عرض کرنے کے واسطے
"مجبور کرتا ہے کہ قبل اسکے کہ جناب بار عہدہ آنریری سکریٹری سے سبکدوش
"ہوں انکی خدمات کا اعتراف کسی مناسب طریقہ سے ضرور فرمایا جائے۔ بالفعل
"اس عہدہ کی تنخواہ تین سو روپیہ ہے جو انکی ترقی تک محدود ہے۔ لیکن میں یقین رکھتا
"ہوں کہ اگر حضور کے مبارک عہد میں وہ موقع آئے کہ انکی تنخواہ پوری تین سو روپیہ
"کی ہو جاتی تو پھر ایک سال بعد از راہ انصاف و قدردانی واثق حضور خود بخود از خود

"یہ تحریر فرماتے کہ جیسے ماہوار کی ترقی ہر سال جاری ہے۔ حتیٰ کہ انتہائی
"تنخواہ چار سو روپیہ ہوجاوے۔ جناب گیلفرڈ کوئی تحریر یا یادداشت یا تذکرہ تحریری
"ایسا ہونا جس سے یہ اسکیم آئینی جنبش ہوسکے۔ عین مصلحت اور قدر دانی والا حکام
"ہوگی۔ اسسٹنٹ سکریٹری کے عہدہ کا پوزیشن قائم رکھنا اور اسکے واسطے ایسے
"توقعات پیدا کرنا جسکی وجہ سے قابل اشخاص بہ آسانی مل سکیں ایک
"ایک نہایت اہم مسئلہ ہے جسکی ضرورت جناب سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے
"اس شریف نوجوان کی بابت اس سے زیادہ ایک لفظ نہیں کہوں گا کہ اس زمانہ
"قحط الرجال میں یہ کالج کی خوش قسمتی ہے کہ یہ شخص اس عہدہ پر ہے۔
"اس تحریر کا باعث خود میرا ذاتی خیال ہے کسی شخص کی طرف سے نہ اب اس کے
"قبل چلتے یا صراحتاً یا ضمناً کبھی بھی اسکی بابت یا ایسی کسی خواہش کی بابت
"ملاقات کوئی ذکر نہیں ہوا اور نہ اسوقت تک اس راز سے سوائے ذات علام الغیوب کے
"کوئی نفس واقف ہے"۔

[illegible] آنریری جائنٹ سکریٹری [illegible]

۳۰۰

دربارہ اضافہ تنخواہ محمد ابوبکر صاحب ہیڈ اسسٹنٹ سکریٹری ریاست [illegible]

بخدمت جناب آنریری سکریٹری صاحب [illegible]

[illegible]

جناب والا

مسئلہ مندرجہ بالا کی بابت جناب کے کاغذات میرے پاس بغرض تحریر رائے ارسال ہوئے

لہذا اس کی تفصیل اس بارہ میں حسب ذیل عرض کرتا ہوں ۔

(۱) ریزولیوشن نمبر ۱۱ جلسہ [illegible] منعقدہ ۲۶ [illegible] ۱۹۰۷ء [illegible]

[illegible] آنریری سکریٹری کا تقرر [illegible] ماہوار تک ہو ۔

نقل ریزولیوشن نمبر ۱۱

۱ یہ قرار پایا کہ [illegible] آنریری سکریٹری کے فرائض کے متعلق اور [illegible]

تمام کاموں کی نسبت [illegible] آنریری سکریٹری کو [illegible] تمام کاموں [illegible]

[illegible] ایک ہیڈ اسسٹنٹ سکریٹری [illegible] کا تقرر ہو کہ جو [illegible] دفتر کی ترتیب

اور درستی کی [illegible] آنریری سکریٹری کے [illegible] انجام دے سکے [illegible] تمام

کی نگرانی [illegible] اس عہدہ دار کی تنخواہ [illegible] روپیہ ماہوار تک ہو ۔

چنانچہ اس ریزولیوشن کی [illegible] تلاش کی گئی اور [illegible]

[illegible] اس عہدہ پر [illegible] مولوی ابوالحسن صاحب [illegible]

باب

[illegible] عمر [illegible] روپیہ ماہوار [illegible] شرط

یہ کی تھی کہ [illegible] سالانہ اضافہ شمار ہوگا ۔ کس حد تک سالانہ اضافہ ہوتا رہے گا؟

نامہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے ۔ صاحبزادہ جناب [illegible] اجلاس

بحث میٹنگ منعقدہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۰۶ء میں حسب ذیل [illegible] کیا تھا [illegible] منظور [illegible] میٹنگ [illegible]

[illegible] تقرر [illegible] تنخواہ [illegible]

اور [illegible] سالانہ اضافہ جبتک [illegible] روپیہ ماہوار [illegible]

یہ بات [illegible] ظاہر ہوتی ہے [illegible] کی تشریح کر دی گئی ہے کہ [illegible] سالانہ [illegible] تنخواہ [illegible]

جبتک [illegible] پوری [illegible] ہو جاوے ۔ [illegible] میٹنگ [illegible]

تھا کہ " یہ امر [illegible] ثابت [illegible] اور [illegible]

[illegible] ثابت کریں " [illegible] میں [illegible] فیصلہ اس امر کی بابت [illegible] میٹنگ [illegible]

[illegible] کیا ہوتی کہ آیا [illegible] صاحب [illegible] منظور [illegible]

[illegible] روپیہ ماہوار تک اضافہ دیا جاوے ۔

[illegible] تمام [illegible] معلوم ہوتا

کہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] تعلیم میں اوائل [illegible] سے [illegible] حالت [illegible] رہا [illegible]

قدر کرنے یا کم اگر ہم اور اسکو [illegible] صاحب [illegible] دینے میں [illegible] بے تعلق [illegible] ممکن ہوتا — تاہم جو تمام [illegible]

ہمارے میں جیسے رائے درست [illegible] اور بیچ [illegible] شکوک [illegible] ملک [illegible] برابر

ترقی [illegible] کی بابت (باوجود [illegible] سابقہ مسٹر [illegible] حسب [illegible] موشن [illegible] انہی

[illegible] تمام [illegible] حاصل کیا گیا ۔ خاتمہ پر [illegible] لکھنا

اور چونکہ [illegible] خیال [illegible] محبت [illegible] آنریری جائنٹ سکریٹری صاحب بہ زمانہ نواب محسن الملک مرحوم

[illegible] جیسے کہ نواب وقار الملک مرحوم [illegible]

عمدہ [illegible] اسسٹنٹ سکریٹری [illegible] ناموں تک تبدیل کر کے ترقی دلانا چاہتے تھے ۔ اور بہ زمانہ

قائم مقام آنریری سکریٹری [illegible] میرا یہی خیال رہا اور اسی خیال کی بنا پر [illegible] ایک وقت

ترقی [illegible] کی بابت ریمارک کئے ہیں ملاحظہ ہو روئداد [illegible]

اجلاس کمیٹی منعقدہ ۷ اکتوبر [illegible] صفحہ ۳ و ۴ [illegible] روئداد [illegible]

کمیٹی منعقدہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۸ صفحہ ۴ [illegible] ۔ ابھی [illegible] تحریر کی معافی

چاہتا [illegible] کہ اس کی بابت میں اضافہ [illegible] بذریعہ [illegible] جاوے گا فقط

[illegible] محمد [illegible] جائنٹ سکریٹری [illegible] ۷ [illegible] ۱۹۰۹

مشتاق حسین
[illegible]
۱۹۱۲

[illegible]

TRUE-COPY

[illegible]

10981/97 2/2

[illegible]

[illegible]

جس میں شرائط تقرر حسب ذیل درج ہیں:

۱۔ اس عہدہ کا نام پرنسپل اسسٹنٹ ٹو دی پرنسپل ایم اے او کالج ہوگا۔

۲۔ اور ٹرسٹیان کے فرائض ہوں گے جو میں نے اس عہدہ کا تجویز کرتے وقت لکھے ہیں اور جس کی ایک

نقل آپ کے دیکھنے کے لیے بھیجی جاتی ہے۔

۳۔ تنخواہ اس عہدہ کی شروع میں [illegible] ماہانہ ہوگی اور ہر سال [illegible] کا اضافہ ہوگا جب تک

وہ [illegible] ہو جاوے — بجائے اس کے، شعبہ کی پوسٹ [illegible] عہدے ایم اے او کالج

کے [illegible] کالج سے دے جا سکیں گے۔"

اس خط کا کوئی جواب اقراری یا انکاری ابوالحسن صاحب کی طرف سے مسل میں شامل نہیں ہے جس میں

ایک خط مولوی [illegible] صاحب سیکرٹری ایم اے او کالج کا شامل ہے (یہ خط مورخہ [illegible] میں [illegible] سیکرٹری

اس کی تحریر سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نواب محسن الملک مرحوم کی تحریر [illegible]

ابوالحسن صاحب کو [illegible] کی ایک [illegible] اور [illegible] کو [illegible]

تھی، [illegible] ایم اے او [illegible] اور نواب محسن الملک مرحوم نے انکی عہدے اسسٹنٹ سکریٹری پر فوراً

پرنسپل اسسٹنٹ [illegible] پر مقرر کیا، [illegible] نواب وقار الملک مرحوم کی رائے متعلقہ اضافہ مسٹر

ابوالحسن صاحب [illegible] ہوتی ہے [illegible] اور [illegible]

پرنسپل [illegible] اور [illegible] ابوالحسن صاحب کو اسسٹنٹ سکریٹری [illegible] ہے، اس کے علاوہ [illegible]

برابر [illegible] اسسٹنٹ سکریٹری [illegible] اور [illegible] پرنسپل اسسٹنٹ — لیکن کوئی وجہ سمجھ کر [illegible]

اونکو مقرر ہے کہ سر پرویز صاحب آپکے اضافہ کی ساتھ پوری تنخواہ عہدہ مذکور یعنی تین سو روپیہ
ماہوار ملنے لگی اور ترقی نہ دیجاوے جو اس عہدہ کیواسطے ایک منفصل شدہ منظور ہے ۔

۲۔ نظرہ عملہ کے سند رجات سے قطع نظر کرکے صورت واقعہ یہ ہے کہ ابوالحسن حبیب اللہ کا تقرر
اس عہدہ پر بتاریخ [illegible] سنہ [illegible] سے ہوا ہے اور تب سے جس خوبی و خوش اسلوبی، محنت، شرافت،
دیانت، امانت، معاملت، عزت اور خوبی کی صحبت کیساتھ اونھوں نے یہ کام انجام دیا ہے
وہ حال اوسکی صاحب اور نیز جناب والد ماجد کو بخوبی تمام ظاہر ہے ۔ اور لوگوں کی ملکی و قومی
رائے اور سرکاری زمانہ قیام نظامی کی کثرت رائے سے اوسکی تائید ہوتی ہے ۔ منتظر ہیں کہ اس عہدہ کے
واسطے ہر حالت کے اعتبار سے اونسے زیادہ موزوں شخص سرکار کو مل سکتا اگر محال نہیں تو سخت
مشکل ضرور ہوگا گویا کہ خداوند تعالی نے اونکی ذات کو اسی کام کیواسطے پیدا کیا ہے ۔ پس اگر کسی اور اعتبار سے
نہیں تو خاص اسوجہ سے کہ جو شخص جس قدر مستحق ہو اوسکی ساتھ ویسا ہی سلوک کیا جانا بھی لازم
ہے کہ اونکو ہر [illegible] روپیہ کا اضافہ دیا جائے تا بجلدیکہ ۳۰۰ ماہوار ہو جائے ۔

اور اس عہد [illegible] [illegible] اور ترقی [illegible] سمجھا جاتا ہے کہ [illegible] نے ایک بار
[illegible] - اور [illegible] اس عہدہ [illegible] اور [illegible]
[illegible] اور [illegible] بلکہ اس کو [illegible]
[illegible] ہے - اور اس [illegible] اور [illegible] ضروری [illegible] ایک واقعہ [illegible]
[illegible] نے اور بھی زیادہ خوش اسلوبی کے ساتھ ثابت کر دیا ہے -

[illegible]

☆☆☆

Chashm-e-Nam

Naushaba Siddiqui



میرے قلم سے اور بھی

A Text Book of Economic Theory
by
Stonier & Hague for BA. BCom. MA
(Translation)

کتابِ معاشیات ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ انٹر کامرس کے لیے

صلیب کے زخم ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ناول

افکارِ حسن ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مرتّب (والد کی شاعری)

سرِ شام ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ خاکے، مضامین

زندگی بھر کی بات ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ناول

کلامِ اشرف، کمالِ حسن ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ترتیب وتدوین

دلِ شوریدہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مرتّب

چشمِ حیراں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ خاکے (زیرِ تحریر)

ISBN 969946647-2

9 789699 466472

(فلیپ اوّل سے آگے)

اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ وہ ماضی پرست ہے کہ اس نے اپنی زندگی کے حال کو خوب صورتی سے بسر کیا ہے۔ اپنے بچے مثالی طور پر پالے۔ گھر سنبھالنے میں وہ سلیقہ دکھایا کہ مَیں ہی نہیں ہر کوئی قائل ہے۔ شاندار کارکردگی کے ساتھ ملازمت کے چالیس سال گزارے۔ مگر وہ اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں، اپنی زندگی کے گزرے ابتدائی چار پانچ برسوں کو ہمیشہ اپنی جان کے ساتھ لیے پھرتی رہی۔ ہجرت نے اس کی زندگی پر ضرور اثر ڈالا لیکن اس نے ہمیشہ یہ سمجھا کہ وہ ہجرت پر مامور تھی، مجبور نہیں۔

نوشابہ نے ان کاغذات کی مدد سے ''کمالِ حسن'' جیسی کتاب مرتّب کی جس میں اس کے آباؤاجداد کی کہانی دفن ہے۔ ''کلامِ اشرف'' میں اپنی دادی کے کلام کو محفوظ کیا۔ ''افکارِ حسن'' میں اپنے ابّا کی شاعری کو مرتّب کیا۔ اسی پر بس نہیں، وہ ان سب کے جوتے میں اپنے پاؤں ڈال کر وہ تمام جگہیں دیکھنا چاہتی تھی جو اُن بزرگوں کے تھے۔ وہ ہندوستان گئی۔ اتنے آنسو بہا کر آئی کہ اگر صرف ایک مقام پر بہاتی تب زمین پر ایک جھیل ضرور نمودار ہو جاتی۔ واپس آ کر اس نے چشمِ تر کے ساتھ مجھے ساری کہانی سنائی اور اب چشمِ نم کے ساتھ اس کی تحریر آپ کے سامنے ہے۔ یقیناً اسے پڑھتے ہوئے آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں نہ بھی ہوئے تو آنکھیں بھیگ ضرور جائیں گی۔

نثار اختر